بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام

اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (القرآن)

بات مانو اللہ اور رسولؐ (یعنی مرکزِ ملت) کی جب وہ تمہیں
اس کام کی طرف بلائے جو تمہارے لئے زندگی بخش ہو

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ - فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ - شَذَّ فِي النَّارِ (قول الرسول)

جماعت کا ساتھ لازم سمجھو کیونکہ جو الگ رہا وہ جہنم میں گیا

لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ (حضرت عمرؓ)

جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

داد چوں آں قوم مرکز را ز دست
رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

چیست ملت اے کہ گوئی لاالہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ

مردۂ؟ از یک نگاہی زندہ شو
بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام دہلی

(دور جدید)

مدیر { مسئول۔ حکیم ذکی احمد خاں | معاون۔ محمد عثمان

بدل اشتراک پانچ روپیہ سالانہ — فی پرچہ ۸/

جلد ۱ شمارہ ۱ بابت ماہ مئی ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ	ارباب قلم	مضامین	صفحہ	ارباب قلم
طلوع اسلام	۱	مُدیر	دین فطرت	۲۱-۳۳	جناب غلام احمد صاحب پرویز بی اے
پیشکش بحضرت اقبال مدظلہ	۲	"	نظریۂ قومیت	۳۴-۳۹	از "رازی"
آبروئے ما زنام مصطفےٰ است	۳	حضرت علامہ اقبال مدظلہ العالی	بصائر	۴۰-۴۸	از دیدہ ور
گوہر نایاب	۵	حضرت علامہ اقبال مدظلہ کے غیر مطبوعہ خطوط	کانگریس لیگ اور مسلمان	۴۹-۶۴	جناب ڈاکٹر سید حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر
ایک ضروری گزارش	۶	جناب سید نذیر نیازی صاحب	اکل حلال	۶۵-۶۹	جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی
افتتاحیہ	۷-۱۳	مُدیر	تکلف برطرف	۷۰-۷۱	ادارہ
لمعات	۱۴-۱۸	"	اچھوت	۷۲	"
اے ہمنفس (نظم)	۱۹	جناب اسد ملتانی	رفتار زمانہ	۷۳-۷۸	"
فہم قرآن	۲۰-۳۰	حضرت مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری	کشت خیال	۷۹-۸۰	از مفکر

پیش کش

ہم کمالِ عقیدت و نیاز مندی کے ساتھ رسالہ "طلوعِ اسلام" کو
ترجمانِ حقیقت حکیم الاُمت حضرت علامہ اقبال مدظلہ العالی کی خدمتمیں
پیش کرنے کی جسارت کرتے ہوئے آرزو رکھتے ہیں کہ جس طرح نئی روشنی کی
پیدا کردہ تاریکی میں اُنکا جلوۂ فکر آفتابِ اسلام کے نئے طلوع کا موجب ہوا ہے
اسی طرح یہ رسالہ اُنکے پرتوِ افکار سے حقیقی معنوں میں اسم بامسمٰی ثابت ہو۔

"طلوعِ اسلام" نہایت ادب سے اُن کے حضور میں متقاضی ہے کہ

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمنِ حُسن
بہ خوشہ چینیٔ آئینہ کم نمی گردد

"ادارہ"

آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

طور موجے از غبارِ خانہ اش | کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش | تاجِ کسریٰ زیرِ پائے اُمتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید | قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم | تا بہ تختِ خسروی خوابید قوم
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز | دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در دُعائے نصرت آمیں تیغِ او | قاطعِ نسلِ سلاطیں تیغِ او
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد | مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
ہر خداوندِ کہن را او شکست | ہر کہن شاخ از نمِ او غنچہ بست

اے پناہِ من حریمِ کوئے تو
من بامیدے رمیدم سوئے تو

اقبال

گہرِ نایاب

طلوعِ اسلام حضرت علامہ کے ان غیر مطبوعہ اشعار کی اشاعت پر جسقدر بھی فخر و مسرت کا اظہار کرے کم ہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

اقبال

ایک ضروری گذارش

خریدارانِ طلوعِ اسلام کی خدمت میں

حضرات!

السلام علیکم۔ میں دلی مسرت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ طلوع اسلام کی ترتیب و اشاعت اور نظم ونسق کے فرائض اب مستقلاً ایک ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہیں جو اس کے اغراض و مقاصد یعنی ہندوستان کی سیاسی اور اجتماعی کشاکش میں "اسلامی رائے" کی ترجمانی کو بفضلہٖ تعالیٰ راقم الحروف سے کہیں بہتر اور احسن طریق پر سرانجام دے گی۔ میں خوش ہوں کہ جو کام تنہا ایک فرد سے نہ ہو سکا وہ بالآخر احباب کی متفقہ کوششوں سے پورا ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے قدردانِ طلوع اسلام بھی موجودہ ذمہ داریوں میں ہر طرح سے ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس امر کی معذرت کرنا ہے کہ پچھلے دو ڈھائی سال میں طلوع اسلام کی انتظامی دشواریاں اور مالی خسارہ اس کی باقاعدہ اشاعت میں باربار التوا اور انقطاع کا موجب ہوتا رہا۔ بہرکیف یہ ایک دور تھا جو گذر گیا۔ طلوع اسلام کے جدید انتظامات اب ایک مضبوط بنا پر قایم ہیں اور مجھے اُمید ہے کہ خریدارانِ طلوع اسلام کی عملی ہمدردی اسے مضبوط تر کردے گی۔ انشاء اللہ

مارچ ۱۹۳۸ء　　　سید نذیر نیازی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے	ذرۂ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

ایک کمزور و ناتوان، غریب و نادار بھکاری کی یہ حالت تھی کہ بیچارا صبح سے شام تک ایک ایک شخص کے سامنے دست سوال دراز کرتا، ہر ایک دروازے پر جھولی پھیلاتا تو بمشکل اتنا پاتا کہ اس سے اپنا پیٹ پال سکے کبھی اتنا بھی نہ ملتا تو فاقہ کا شکار۔ اس کی ساری عمر یونہی بسر ہو گئی۔ وہ مرتے وقت وصیت کر گیا کہ اسے اس کی جھونپڑی میں ہی دفن کر دیا جائے۔ جب اس کی قبر کھودی گئی تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے پرانے وقتوں کا ایک گراں بہا خزانہ مدفون ہے۔ بھکاری کی تباہ حال زندگی اور یہ خزانہ .... لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا تھا۔

بھکاری اور خزانہ کا واقعہ حقیقت ہو یا افسانہ، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج مسلمان کی بھی یہی حالت ہو رہی ہے۔ اس نے دنیا میں اپنے آپ کو سب سے نادار، ہر ایک کا دست نگر سمجھ رکھا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے پاس ایک ایسا خزانہ موجود ہے جو اسے ساری دنیا سے بے نیاز کر دے۔

بھکاری کے دکھ کا علاج اسے ایک پیسہ خدا کی راہ میں دیدینا یا اس کی طرف روٹی کا ٹکڑا پھینک دینا نہ تھا۔ بلکہ اس کی سچی مدد یہ تھی کہ کسی اللہ کے بندے کو معلوم ہوتا تو اسے اس کے خزانہ کا پتہ دیدیتا۔ آج مسلمان کی مصیبتوں کا مداوا بھی یہی ہے کہ اسے اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرا دیا جائے جو اس کی خستہ سامانیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے۔ یہ متاع گراں بہا **قرآن کریم** ہے جو ایک عرصہ سے مسلمان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے اور اب یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس کے اندر ہے کیا!!

آپ کہیں گے کہ مسلمان قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے ترجمے سنتے ہیں۔ تفسیروں کا درس دیا جاتا ہے۔ اس کی اشاعت کرتے ہیں اور کیا چاہیئے؟ لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائیگا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ قرآن کریم کی حفاظت یا اس کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت قائم رکھنے کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن محض حفاظت اور عقیدت، تو مقصود بالذات نہیں۔ قرآن کریم کے متعلق مسلمانوں کا دعوے ہے۔ اور یہ دعویٰ خود قرآن کریم ہی پر مبنی ہے کہ خدائے حی و قیوم کی یہ زندہ و پائندہ کتاب ایک مکمل دستور العمل ایک بہترین ضابطۂ حیات ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں

ان کے لئے خضر راہ ہے۔ مسلمان کی تو زندگی ہی اس میں تھی کہ وہ ہر ایک قدم اٹھانے سے پیشتر اس امر کا جائزہ لے کہ وہ اپنا قدم اسی جادۂ مستقیم پر لے جا رہا ہے جو قرآن کریم نے دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کی مدنیت و عمرانیت۔ معاش و معاشرت۔ مذہب و سیاست غرضیکہ ہر مسئلۂ حیات کا حل اسی ایک نظام کی رو سے ہونا چاہیئے اس کے تمام افکار و تخیلات۔ اس کے تمام رجحانات قلبی و ذہنی۔ اس کے تمام تصوراتِ دینی و دنیاوی سب کی تشکیل اسی ایک سانچے میں ہونی چاہیئے۔ اس کے پاس حقائق کے پرکھنے کا معیار ہو تو یہی۔ اور صداقتوں کے ماپنے کا پیمانہ ہو تو یہی۔ یہ سنے تو اس کی مدد سے۔ دیکھے تو اس کی روشنی میں۔ سمجھے تو اس کی بصیرت سے۔ اور اس طرح یہ اس ایک دروازے پر جھک کر ساری دنیا کے دروازوں سے مستانہ وار۔ بے نیاز گذرتا جائے۔

آپ جس مسلمان سے پوچھئے۔ وہ بلا تکلف کہدیگا کہ الحمد للہ میرا بھی یہی ایمان ہے لیکن کیا آج ہو بھی یہی رہا ہے۔ کیا مسلمانوں کی زندگی کا عملی حل قرآن کریم سے ہی تلاش کیا جاتا ہے!! کیا ان کا دستور العمل حیات واقعی خدا کا یہ آخری پیغام ہے۔!!!

اس کا جواب اپنے گردو پیش نظر دوڑا کر خود اپنے آپ سے لیجیئے۔

لیکن اس تصویر کا اس سے بھی زیادہ بھیانک پہلو ایک اور ہے۔ یہ حفاظت و عقیدت کی نمود پر قرآن کریم سے لگاؤ کونسے مسلمانوں کو ہے۔ کیا انہی کو نہیں جو اب قصۂ ماضی بننے والے ہیں۔ لیکن ذرا اس طبقہ پر نگاہ ڈالیئے جو کل کو امت مسلمہ۔ ملت اسلامیہ کہلانے والا ہے۔ یعنی آج کے نوجوانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ۔ جانے والے مسلمانوں نے اس فضا میں پرورش پائی جہاں پھر بھی کچھ نہ کچھ مذہب کا چرچا تھا۔ لیکن یہ آنے والے مسلمان اس ماحول کے تربیت یافتہ ہیں جہاں اور سب کچھ ہے لیکن خدا اور رسول کا ذکر نہیں۔ ذرا کسی نوجوان مسلمان تعلیم یافتہ کے مکان پر جایئے دنیا بھر کا لٹریچر اس کی الماریوں میں ملے گا۔ لیکن اگر نہیں ملے گا تو قرآن کریم کا نسخہ۔ وہ اپنے بچوں کو بڑے فخر سے آپ کے سامنے لائے گا یہ بتانے کے لئے کہ یہ اتنی سی عمر میں کس طرح فر فر انگریزی بولتے ہیں۔ یہ قابلِ تحسین بات ہے۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ بیٹا! کلمہ بھی آتا ہے۔ تو وہ آپ کا منہ تکتے رہ جائیں گے کہ یہ کس دیس کی بولی بولتا ہے۔!

پھر آپ ان کی درسگاہوں میں جایئے اور دیکھیئے کہ وہاں مذہب سے بیگانگی۔ نہیں بلکہ نفرت پیدا کرنے کے کس قدر سامان موجود ہیں۔ نتیجہ ان تمام اثرات کا یہ ہے کہ آپ کی قوم کے

نوجوان مسلمانوں کا سا نام تو رکھتے ہیں۔ کہ اس پر انہیں اختیار نہ تھا۔ اور اب تو نام کو بھی اس انداز سے مڑوڑتے ہیں کہ اس سے شناخت ہی نہ ہوسکے کہ آپ کس ملت سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کے قلب دماغ کی تعمیر یکسر غیر اسلامی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ جو ذرا متین وسنجیدہ ہوں گے وہ دل ہی دل میں مذہب کے خلاف بغاوت کی آتش خاموش سلگاتے رہیں گے۔ جو بزعم خویش آزاد قسم کے ہوں گے۔ وہ علانیہ تمسخر اڑائیں گے۔ پھبتیاں کسیں گے۔ اور یہ سمجھیں گے کہ وہ بہت بڑا جہاد کر رہے ہیں۔

لیکن یہ ان کا قصور نہیں۔ قصور سب ہمارا ہے کہ ایک طرف ہم نے انہیں مذہب سے ناآشنا رکھا۔ اور دوسری طرف ان کو تعلیم اس ڈھنگ پر دلائی جس میں مذہب کے خلاف سرکشی کے تمام سامان موجود تھے۔ اور جہاں کہیں مذہب کی تعلیم کا انتظام بھی کیا وہ اس انداز کا تھا کہ اس سے ان کی بیگانگی الٹی نفرت سے بدل جائے۔

لیکن ذرا تصور میں لایئے اس وقت کو کہ جب آپ نہ ہوں گے اور انہی نوجوانوں کی جماعت کا نام مسلمانوں کی قوم ہوگا۔ مفاد اسلامی کے تحفظ کے لئے آپ کی ہر کوشش لائق صد تحسین۔ لیکن سوچئے تو سہی کہ جن کی خاطر آپ یہ تحفظ کے سامان پیدا کر رہے ہیں۔ ان کی نگاہ میں آپ کے اسلام اور اس کے مفاد کی کوئی وقعت بھی ہے! غور فرمایئے کہ کہیں آپ اس نیام کی نگہ پرداخت میں تو مصروف نہیں جس کے اندر تلوار لکڑی کی ہے۔!!

بایں ہمہ نوجوانوں سے مایوس ہوجانے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ایسے نوجوان بہت کم ملیں گے جنہیں اگر صحیح اسلام سے روشناس کرا دیا جائے۔ تو پھر بھی وہ اپنی لادینی پر مصر ہوں۔ یہ ساری ہی کوتاہی ہے کہ آنے والی قوم مذہب سے متنفر ہو رہی ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جنہوں نے پچھلے دنوں چند صاحب ہمت، دردمند مسلمانوں کے ایک مختصر سے حلقہ کو دعوت غور وفکر دی جن کی اکثریت نوجوانوں ہی پر مشتمل تھی۔ وہ کافی غور وتدبر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ بڑی بڑی سکیموں۔ شاندار پروگراموں۔ تہلکہ انگیز تحریکوں کو چھوڑیئے، وقت وہ آگیا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں "ایک ایک دو دو کرکے ہی خدا کے لئے اٹھ کھڑے ہو" "پھر سوچو" کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ تجویز یہ ہوئی کہ مسلمان کو اس کی متاع گم گشتہ۔ اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرانے کے لئے کچھ کیا جائے۔ اس کا پہلا قدم یہ ہو کہ ایک ماہوار مجلہ شائع کیا جائے جو ملت اسلامیہ کی حیات اجتماعیہ کا نقیب ہو۔ اور ان کی ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرے اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پر یہ حقیقت واضح کرسکے کہ قرآن کریم کوئی ایسی کتاب نہیں جسے ہم دور حاضرہ

کی چلکتی ہوئی تہذیب اور دمکتے ہوئے فلسفہ کے سامنے لانے سے شرمائیں بلکہ یہ کہ انسان علم و عقل کی جن بلندیوں تک چاہے اڑ کر چلا جائے۔ خدا کا یہ پیغام ازلی وہاں سے بھی دس قدم آگے ہی نظر آئے گا۔ اور جب ساری دنیا کی یہ حالت ہو جائے گی کہ۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے۔

تو اس وقت تمام دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لئے۔ عدم سکون و فقدانِ اطمینان کی اِس آگ کو فرو کرنے کے لئے جس کے شعلوں میں آج انسانیت یوں لپٹ رہی ہے۔ وہی نظام کار فرما ہو گا جو قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے۔ اور جس کے سوا اور کوئی نظام فطرتِ انسانی کے مطابق نہیں ہو سکتا کہ یہ نظام خود خالقِ فطرت کا متعین فرمودہ ہے۔

پھر خدا کے اس پیغام ازلی کو پیش کرنے والے حضرات ایسے ہوں کہ جن کی انگلیاں ملتِ اسلامیہ کی نبض پر اور جن کی نگاہیں رفتارِ زمانہ کے مقیاس پر ہوں۔ اور ان کا اسلوب بیان اس درجہ دلکش ہو کہ اگر ادبی مذاق رکھنے والے حضرات ان مضامین کو محض ذوقِ ادب کی رعایت سے ہی پڑھنا شروع کریں تو بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہے۔ اور جب وہ انہیں ختم کریں تو غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے قلب پر وہ ایک ایسا اثر چھوڑ جائیں جو الحاد و کفر نوازی کے تمام شکوک و شبہات کو رفع کر کے ان کے دل میں یہ یقین پیدا کر دے کہ فی الواقع قرآن کریم خدا کی کتاب ہے اور نوعِ انسانی کی ہر مشکل کا حل ذہن انسانی کی ہر سطح کے مطابق۔ اس کے اندر موجود ہے۔

رسائل کے اجراء میں سب سے بڑا جاں گسل اور جگر گداز مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ اقتصادی مشکلات میں پھنس جاتے ہیں اور خریداروں کی کمی سے رسالہ اپنا خرچ پورا نہیں کر سکتا جو رسالہ اپنے اجراء سے پیشتر اس مشکل کا حل تجویز کر رکھتا ہے وہی چل سکتا ہے۔ ورنہ شروع سے ہی خریداروں کے آسرے پر جینے کی توقع کرنے والے پرچے کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ...... ہر قدم پر۔ ہے نے گمان۔ یاں رہ گیا......... واں رہ گیا۔

چنانچہ اس مشکل کا حل پہلے سوچ لیا گیا ہے۔ اِس جماعت کے ہر رکن نے ایک متعین رقم ادا کر کے اتنا سرمایہ فراہم کر دیا ہے کہ جو رسالہ کے خسارہ کا کفیل ہو سکے اور انہوں نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ جب تک رسالہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا نہ ہو جائے وہ اس خسارہ کو پورا کرتے رہیں گے۔ اور اس کے منافع میں سے ایک پائی بھی اپنے لئے نہیں لیں گے۔

لہٰذا یہ پرچہ ایک فرد کی بجائے ایک جماعت کا پرچہ ہوگا۔ اور یہی جماعت اس کی مالک و مختار ہوگی۔ اس جماعت کا ہر رکن اس کا محافظ و نگران ہوگا۔ کہ اس کے ساتھ اس کا قلبی تعلق وابستہ ہے لیکن یہ جس متعین مسلک کا آئینہ دار ہوگا اس میں کسی فرد کو دخل نہ ہوگا۔ تمام امور باہمی مشاورت اور قرآن کریم کے نظام کے ماتحت سرانجام پائیں گے۔ جو حضرات اس امدادی پروگرام میں عملی حصہ لینا چاہیں۔ وہ اسکی تفصیل دریافت فرمائیں۔ اگر یہ سلسلہ وسیع ہوگیا تو کیا عجب کہ یہی ننھا سا پودا ایک دن ایک بار آور تناور درخت بن جائے كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ اس شجر طیب کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جسکی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں

دورِ حاضرہ کے مسلمانوں کی انتہائی خوش بختی ہے کہ انہیں آج مسائلِ حیات کا حل قرآنی روشنی میں تلاش کرنے کے لئے کچھ زیادہ جگر کاوی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ڈوبتی ہوئی قوم میں ایک ایسی گراں قدر ہستی کو پیدا کیا ہے جس نے اپنے دل و دماغ کی بہترین متاع کو تمام عمر انہی مسائل کے حل میں صرف کر دیا۔ اور اسکے نتائج کا درخشندہ موتیوں کی طرح بلا معاوضہ قوم کے سامنے انبار لگا دیا۔ یہ بیش بہا خزانہ آج "کلامِ اقبال" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس پرچہ کی خوش نصیبی ہے کہ پیامِ اقبال کی نشر و اشاعت اس کا مقصد ہوگا۔ آج ملتِ اسلامیہ کی زندگی کا راز اس "پیام" کے اندر ہے کہ یہ پیام دراصل قرآن کریم کا پیام ہے۔ حضرت علامہ مد ظلہ العالی کی باریک بیں اور دوررس نگاہیں حقائقِ قرآن کے سمجھنے میں جن بلندیوں تک پہنچ چکی ہیں۔ اُن سے کوئی دیدہ ور نا آشنا نہیں۔ ملتِ اسلامیہ اللہ تعالیٰ کی اس موہبتِ عظمیٰ پر جسقدر بھی ناز کرے بجا ہے۔

سابقہ **طلوعِ اسلام** کا نام بھی حضرت علامہ کا ہی تجویز کردہ تھا۔ اور اس کا مسلک بھی یہی تھا۔ جن زہرہ گداز مشکلات کے ماتحت اس پرچہ کی اشاعت بند ہوئی۔ اُن کے تذکرہ کی یہاں ضرورت نہیں البتہ اس کے بند ہونے کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اُس کے احساس کا اظہار تو مجبوراً ہو جاتا ہے۔ گذشتہ یوم "اقبال" کی ترتیب کے سلسلہ میں جب دہلی کا قافلہ حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہیں بھی طلوعِ اسلام کے احیا کے لئے مضطر پایا۔

ان حالات کے پیشِ نظر اس پرچہ کا نام بھی "طلوعِ اسلام" ہی رکھا گیا ہے۔ اربابِ معنی کے نزدیک تو گویا یہ سابقہ طلوعِ اسلام کا ہی دورِ جدید ہے۔ حضرت نذیر نیازی (مدیر سابقہ طلوع اسلام) کا اس باب میں اعلان آپ دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں گے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ انکی عنایات و توجہات اسی طرح اس پرچہ کے شاملِ حال رہیں گی۔ جیسی کہ انکے اپنے پرچہ کے ساتھ تھیں۔ در حقیقت یہ ہے کہ یہ

پرچہ بھی کسی غیر کا نہیں ہے۔ یہ تو ملتِ اسلامیہ کے ہر دردرکھنے والے مسلمان کی مشترکہ متاع ہے۔ یہ تو محض انتظامی معاملات اور ذمہ داریوں کی کفالت کی بنا پر ہے جو اسے اُس جماعت کا پرچہ کہا جائے گا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ سابقہ طلوع اسلام کے خریداران اور بہی خواہان اسے اپنا ہی پرچہ تصور فرمائیں۔

پھر ہماری خوش بختی ہے کہ ہندوستان کے ممتاز اہل الرائے اور اہل قلم حضرات کی ایک جماعت کی توجہات وعنایات ہمارے شاملِ حال ہیں۔ اور ان میں سے اکثر حضرات کی نہ صرف قلمی اعانت ہی ہمیں رہینِ منت کریگی۔ بلکہ انکی بالغ نظری اور بلند نگہی ہر مسئلہ میں ہمارے لئے شمعِ ہدایت ہوگی۔ اِس ضمن میں منجملہ دیگر حضرات۔ جناب مولانا اسلم جیراجپوری۔ شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن صاحب قبلہ۔ جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی۔ اے۔ جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (مدیر ترجمان القرآن) ڈاکٹر تصدق حسین صاحب خالد۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بارایٹ لا۔ جناب محمد اسد خان صاحب۔ اسدملتانی۔ جناب راجہ حسن اختر صاحب۔ پی۔ سی۔ ایس۔ خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔

انکے علاوہ دیگر ممتاز اسلامی مفکرین کی توجہات کو مرکوز کرنے کے لئے پوری کوششوں سے کام لیا جائیگا۔ جن حضرات نے "متنوعات" کے ذیل میں مختصر عنوان مستقلاً اپنے لئے منتخب کئے ہیں جنکی ندرتِ فکر۔ وسعتِ نظر اور اصابت رائے۔ ارباب ذوق کے نزدیک مسلم ہے۔ انتظامی معاملات کے متعلق اتنا کہدینا ہی کافی ہوگا۔ کہ جن حضرات کے ہاتھوں میں اِس کا نظم ونسق ہے اُنکی وسعتِ تجربہ بجائے خویش ایک متاعِ گران ہے۔ اور انکی دیانت شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

لیکن یہ تمام انتظامات۔ اور ان سے متعلقہ مساعی۔ یہ تمام تدابیر اور انکی جزرسی۔ یہ ولولے اور یہ ارادے یہ تجاویز اور انکی تکمیل کے لئے کوششیں۔ یہ مقاصد اور ان کے حصول کے لئے ذرائع۔ یہ سب انسانی دماغوں کی تخلیق ہیں۔ جو نہ غلطیوں سے مبرا ہیں نہ سہوا ور فروگذاشت سے منزہ۔ جنہیں نہ کل کے آنے والے واقعات کا علم ہے۔ نہ اُس پر تصرف وقدرت! لہذا یہ تمام انسانی کوششیں پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں رکھتیں۔ اگر اُس خدائے حی وقیوم کا فضل اور اسکی رحمت شاملِ حال نہ ہو۔ کہ موت وحیات۔ کامیابی وناکامی فلاح وخسران۔ اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ اُسکی اعانت شریکِ کار ہو۔ تو ادنیٰ سے ادنیٰ کوشش۔ اور کمزور سے کمزور حرکت وہ نتیجہ پیدا کردے کہ بڑے سے بڑے ساز وسامان رکھنے والے انگشت بدنداں رہجائیں اور اگر وہی شاملِ حال نہ ہو تو دنیا بھر کی قوتیں اور اُن کا ہجوم ایک ذرہ کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ اِس لئے بھروسہ نہ اپنی تدابیر وتجاویز پر ہے۔ نہ قوت واستعداد پر۔ بھروسہ فقط اُسکی ذات پر ہے جو ہر کمزور اور ناتوان کا حقیقی آسرا۔ اور ہر نحیف وزار کا یقینی ملجا ہے۔ بازار مصر میں ایک ضعیفہ کی سوت کی انٹی

یقیناً ہر صاحب دولت وحشمت کے چہرے پر ایک حقارت کی ہنسی کے آثار پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن چہ عجب کہ اُس کے دربار میں جہاں قیمتوں کے معیار بالکل جداگانہ ہوتے ہیں اسی اَنْثی کی قیمت دولتِ کونین سے بڑھ جائے۔ ردّ و قبول تو اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ سادہ دلی کی یہ جرأت ہی کسی کی شانِ استغنا میں ترحم خسروانہ کا ایک ہلکا سا تبسم پیدا کر دے۔ کہ یہ بے بضاعتی ملاحظہ ہو اور اُس کے ساتھ یہ اُمنگیں اور یہ ولولے!! بہر حال جو کچھ ہمارے پاس ہے اُسے لیکر اُس شاہنشاہ گدا نواز کے آستانے پر حاضر ہو رہے ہیں۔ اِس التجا کے ساتھ کہ

کوہِ آتش خیز کُن ایں کاہ را ‌‌‌‌‌ ‌ ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

رہروان را منزلِ تسلیم بخش ‌ ‌ قوتِ ایمانِ ابراہیم بخش

اِن دعاؤں اور ان التجاؤں کے ساتھ یہ پہلا قدم اُس کے رستہ میں اُٹھایا جا رہا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

لمعات

آسٹریا پر ہر ہٹلر نے دفعتاً قبضہ کر کے وسطی یورپ کا نقشہ بدل دیا ہے۔ اور وہ حکومتیں جو جرمنی کی دھمکیوں کو کوئی وقعت نہ دیتی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد سہم گئیں ہیں۔ اور انہوں نے اپنے بچاؤ کے لئے جنگی اسلحہ میں اضافہ شروع کر دیا ہے۔

آسٹریا کا سقوط یوں تو بہت ہی عبرت انگیز واقعہ ہے۔ مگر سقوط کے بعد وہاں کی آبادی پر یاس وقنوط کی جو بلا نازل ہوئی ہے۔ وہ علم اور سائنس کی دنیا کا نہایت دردانگیز حادثہ ہے۔ آسٹریا کے سابق وزرا۔ اور ذمہ دار حکام نے مستقبل سے مایوس ہو کر خودکشی کر لی ہے۔ اور یہودیوں نے اپنی قسمت کا اندازہ لگا کر یہی مناسب سمجھا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیں۔ چنانچہ آخری اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب تک ۱۸۰۰ سو یہودی خودکشی کر چکے ہیں اور سات سو یہودی وہ ہیں جنہوں نے خودکشی کا اقدام کیا۔ مگر کامیاب نہ ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔

خودکشی کے ان واقعات سے ہمارا ذہن دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے اور بصیرت کی نگاہیں صاف معلوم کر لیتی ہیں کہ مادیت کے غلبہ نے انسان کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ موجودہ دنیا نے انسان پر علم اور سائنس کی راہیں کشادہ کیں۔ کائنات کے ذرہ ذرہ کو اس کے لئے مسخر کر دیا اختراعات واکتشافات نے اس کے لئے نئی نئی دنیائیں بنائیں۔ مگر اس میں وہ شجاعت وہ صبر اور وہ استقامت پیدا نہ ہو سکی جس کا سرچشمہ امید و یقین ہے۔ اور جس کی تخلیق مادیت اور روحانیت کے صحیح امتزاج سے ہوتی ہے۔

یہ خودکشی مستقبل سے مایوسی کا نتیجہ ہے اور مایوسی روحانیت کے فقدان اور مادیت کے غلبہ سے پیدا ہوتی ہے اور چونکہ علم اور سائنس کا زمانہ روح و جسم کا توازن کھو چکا ہے۔ اس لئے انسان مصائب سے گھبرا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ کہ دنیا کے مسلمانوں پر ہر جگہ اور ہر زمانے میں مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ اسپین میں الفانسو اور ملکہ ازابلا کی بدولت لاکھوں مسلمانوں کو دیس نکالا ملا اسی ہزار کے قریب زندہ جلائے گئے اور ایک تہائی مسلمان بنوک شمشیر عیسائی بنائے گئے۔ اسی طرح بیت المقدس کی صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کا جو حشر ہوا۔ اور جس بے دردی کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو اونچی اونچی چٹانوں سے گرا کر ہلاک کیا گیا۔ اس کی تفصیلات تاریخ سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔ مگر دیکھو! ان بربادیوں میں کسی ایک مسلمان نے کبھی خودکشی کی؟ کسی کی نسبت سنا کہ اس نے مستقبل سے مایوس ہو کر اور مصائب سے گھبرا کر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا ہو؟ یہ اس لئے کہ مسلمان کے

ضمیر و عقل کی تشکیل جن عناصر سے ہوئی ہے ۔ اس کا خمیر روحانیت اور مادیت کا صحیح امتزاج ہے اور اس کا سرچشمہ وہ قوت ہے جو ایمان باللہ ۔ ایمان بالآخرۃ اور اعمال صالحہ سے پیدا ہوتی ہے ۔ اور کامیابی اور ناکامی ۔ فتح اور شکست ۔ عزت و ذلت ہر حالت میں ایک مسلمان کو مسرور اور پر امید رکھتی ہو اور یہی فرق ہے ۔ مومن اور کافر کی زندگی میں ۔ کہ ایک سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہیں کھوتا ۔ اور دوسرا سب کچھ پا کر بھی کچھ نہیں پاتا

ان تکونوا تالمون فانھم یالمون کما تالمون وترجون من اللہ مالا یرجون (پ۵ ع ۱۲)

اگر تم نے تکلیفیں اٹھائی ہیں ۔ تو تمہارے مخالفوں نے بھی اذیتیں اٹھائی ہیں ۔ اور تم کو تو اللہ سے امید بھی ہے مگر ان کو کوئی امید نہیں ۔

ہندوستان کے مختلف مقامات میں ۔ خصوصیت سے یوپی اور سی پی میں فرقہ دارانہ فسادات نے امن و امان کی فضا بہت زیادہ مکدر کر دی ہے ۔ اور ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ کر یہ ثابت کر دیا ہے ۔ کہ وہ نہ صرف اخلاق و مذہب کے دشمن ہیں ۔ بلکہ انسان ہو کر انسانیت کے لئے ننگ و عار بن گئے ہیں ۔ یہ آسان بات ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق پر الزام لگا کر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے ۔ مگر یہاں سوال سبکدوشی اور الزام تراشی کا نہیں ہے ۔ بلکہ اس مشترک دولت کا ہے ۔ جو تعصب اور عناد کے ہاتھوں سر بازار لٹ رہی اور جس کا نقصان انسانیت کو برداشت کرنا پڑیگا ۔ اور اس پر کوئی ایک قوم نہیں بلکہ ہر قوم ملامت کی مستحق ٹھہریگی ۔

اس امر سے بحث نہیں کہ کس فریق کی زیادتی ہے ۔ کیونکہ جس ملک کی اکثریت کو ہر اعتبار سے برتری اور تفوق حاصل ہو ۔ اور وہ اس برتری کا ناجائز استعمال کر کے " اپنے راج " کے خواب دیکھ رہی ہو ۔ وہاں حقائق خود بخود سامنے آجاتے ہیں ۔ مگر سوال یہ ہے کہ آئندہ ان فسادات کا انسداد کیوں کر ہو ۔ ہندوستان کا انسان کس طرح انسان بنے اور دلوں میں انسانی محبت کا پاک جذبہ کس طرح پیدا کیا جائے ؟ اس مقصد کے لئے قومی شعور کی بیداری کا وعظ ہرگز کارگر ثابت نہ ہوگا ۔ اور نہ یہ تلقین اس مرض کی دوا ہو سکتی ہے ۔ کہ ہر فریق حریت اور آزادی کو اپنا نصب العین بنالے ۔ کیونکہ ہندوستان میں قومی احساس اور وطنی شعور کو جس قدر ترقی حاصل ہو رہی ہے ۔ اسی قدر قوموں میں خود غرضی ، نفرت اور عصبیت کے عناصر بھی پیدا ہو رہے ہیں ۔ اور ہر قوم آزادی کے نام پر اپنے گرد حصار تعمیر کرنے میں لگ گئی ہے ۔

ہمارے خیال میں اس کا علاج یہ ہے۔ کہ قومی کارکن ملک کے لیڈر پرجوش مقرر اور خطیب اور اخبارات کے ایڈیٹر سکون کے ساتھ اپنے جذبات وخیالات کا جائزہ لیں اور سب سے پہلے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ عوام کچھ نہیں کرتے بلکہ ان سے کرایا جاتا ہے اور انکے دماغ خود گمراہ نہیں ہوتے بلکہ اہل دماغ ہی انکو گمراہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی ایسا طریقہ ممکن ہو جس سے ہوشیار ارباب سیاست کی اصلاح ہو جائے۔ تو پھر عوام کی اصلاح کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ مصلحین اور قائدین کی اصلاح کے لئے کوئی نئی مخلوق پیدا نہیں کیجاسکتی مگر اسکے سوا آخر چارہ کار بھی کیا ہے؟ اگر ہمارے قومی کارکن جہاد علی النفس کیلئے اپنے آپکو تیار نہیں کرسکتے تو انکو جہاد آزادی میں حصہ لینے کا بھی کوئی حق نہیں

آجکل ہندوستان میں اردو۔ ہندی کا مسئلہ پھر زور شور سے اٹھا ہے اور کانگریسی ہندوؤں کی ہندی نوازی نے سوئے ہوئے فتنہ کو پھر سر اٹھانے کا موقعہ دیا ہے۔ اور ایک ایسی زبان کو معرض بحث میں لایا جارہا ہے جو نہ صرف ہندو اور مسلمانوں کی مشترک زبان ہے بلکہ ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں کے اتحاد کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کی پوزیشن بالکل صاف ہے وہ یہ نہیں کہتے کہ عربی یا فارسی ہندوستان کی مشترک زبان ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترک زبان وہ ہے جو مشترک قوموں کے اشتراک سے معرض وجود میں آئی ہے اور جسکو ہندو مسلمان دونوں نے ملکر ترقی دی ہے مگر ہندی کے حامی زندہ زبان کو دفن کرنے اور مردہ زبان کو زندہ کرنیکا کرشمہ دنیا کو دکھانا چاہتے ہیں۔ اور اس بنیاد کو اپنے ہاتھوں سے مسمار کر رہے ہیں جسپر خود انہوں نے قومی عمارت کھڑی کی ہے۔ اور جو مختلف قوموں کے لئے ناقابل تسخیر قلعہ کی حیثیت رکھتی ہے

اس وقت زبان کے معاملہ میں ہندوؤں کے دو فریق ہیں۔ پہلا فریق کھلم کھلا ہندی کو ہندوستان کی مشترک زبان قرار دے رہا ہے اور عقل ونقل کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر سیاہ کو سفید کرنے میں مشغول ہے دوسرا فریق اردو۔ ہندی۔ میں مصالحت کرانا چاہتا ہے اور تقریر وتحریر کے ذریعہ یہ ثابت کرنیکی کوشش کررہا ہے کہ اردو ہندی کی بنیاد ایک ہے۔ اور وہ ایک درخت کی دو شاخیں ہیں

یہ دوسرا گروہ پہلے گروہ سے زیادہ خطرناک اور ہوشیار ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مصالحت اور رواداری کے پردہ میں ہندی کے خلاف مخالفت اور تصادم کی قوت کو مضمحل کر کے ایسا موقعہ فراہم کیا جائے۔ جو کسی وقت ہندی کو اردو کی صف میں لے آئے۔ اور پھر اس کو اردو سے آگے نکالکر اپنا مقصد حاصل کر لیا جائے

حالانکہ جس بنیاد پر یہ مصالحت کرائی جارہی ہے وہ سرے ہی سے غلط ہے۔ کیونکہ اس قسم کی مصالحت کسی وقت ہندی فارسی میں کرانے کی کوشش کی گئی تھی۔ جو ناکام رہی۔ اور دونوں کو فرقہ واریت کا الزام لگا کر ترک کر دیا گیا اور ان کی جگہ ایک مشترک زبان کی تخلیق عمل میں آئی جو ہندو مسلمان دونوں کی مشترک میراث ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہندی کی مصالحت کس زبان سے کرائی جارہی ہے؟ پہلے مخالفت تو ثابت ہو مصالحت کا سوال بعد میں آئیگا۔ بلاشبہ ہندی کی مخالفت فارسی زبان سے تھی۔ اگر ہندوؤں کو مصالحت ہی کا شوق ہے تو اجازت ہو کہ پھر فارسی کو میدان میں لایا جائے اور اردو جو ان کی جگہ صلح بن کر آئی تھی۔ اسکو گنگا میں بہا دیا جائے۔ اگر فارسی کی شکل دیکھنی منظور نہ ہو تو کیا ہندی کے حامی مسلمانوں کو اجازت دینگے۔ کہ وہ ہندی کا جواب دینے کے لئے عربی کو میدان میں لے آئیں؟ اگر یہ منظور نہیں تو اردو کے لئے کسی رقیب کو بھی پیدا کرنے کی ضرورت نہیں

بالشویک روس میں ایک مدت سے "غداروں" کا صفایا کیا جارہا ہے اور سلطنت کے بڑے بڑے ارکان فوجی عدالتوں سے سزا پاکر گولیوں سے اڑائے جا رہے ہیں۔ ہر ہفتہ خبر آجاتی ہے کہ بالشویک روس کے فلاں فلاں افسر حکومت کا تختہ الٹنے اور مخالف حکومتوں سے سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتار ہوتے ہی فوجی عدالت میں پیش ہوئے۔ اور جرم کا اقرار کر کے برسر عدالت یہ بھی ارشاد فرمایا۔ کہ "واقعی ہم مجرم ہیں۔ ہم نے بالشویک روس کا تختہ الٹنے کی سازش کی تھی۔ اور فلاں فلاں افسر کو قتل کرایا تھا۔ اس لئے ہمیں دس دس بار گولی ماری جائے" جن لوگوں کو اب تک گولیوں سے اڑایا گیا ہے۔ وہ حکومت کے معمولی ملازم نہ تھے۔ بلکہ مستقل جمہوریتوں کے صدر۔ وزیر اعظم فوجی کمانڈر۔ سفیر۔ انجینیر اور حکومت کے اعضاء و ارکان تھے جنہوں نے اشتراکیت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں بڑے بڑے خطرات اور مصائب کا مقابلہ کیا تھا

اس امر سے قطع نظر کیجئے کہ اشتراکیت کیا چیز ہے۔ اور وہ دنیا کے اقتصادی نظام میں کہاں تک مفید اور موثر ثابت ہوئی ہے۔ بلکہ صرف یہ دیکھئے کہ روس کے "تجربہ گاہ صحت" میں جن مریضوں پر اشتراکیت کا تجربہ کیا جارہا ہے۔ وہ کہاں تک اس سے مستفید ہوئے ہیں اور اشتراکیت کے بانیوں نے اس کا کہاں تک ساتھ دیا ہے۔ اشتراکیت کی قوت۔ اس کی صداقت اور اسکی تاثیر کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے بانی اور علمبردار اس کے ساتھ اپنی وفاداری کا زیادہ دیر تک ثبوت نہ دے سکے اور اپنی غداریوں سے یہ ثابت کر گئے۔ کہ اشتراکیت پہلے تو انسان کو بہادر۔ پرجوش اور متشدد

بناتی ہے۔ اور پھر اس کو اپنے ہی خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے۔ تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہر غیر فطری چیز کا انجام خود کشی ہے۔ اور باطل اپنا گلا آپ گھونٹ کر مر جاتا ہے۔

ہندوستان کی انگریزی درسگاہوں میں نوجوانوں کی ذہنی اور علمی تربیت کے لئے جس قسم کا انتظام کیا گیا ہے۔ وہ دیگر اقوام کے نونہالوں کے لئے مفید ہو تو ہو۔ مگر مسلمانوں کے لئے کسی حالت میں بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ نوخیز طلبا کی مذہبی روح کو فنا کرنے کے لئے نہایت ہی خطرناک حربہ ثابت ہوا ہے۔ جو طلبا۔ اسکولوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں۔ ان میں ایک فیصدی بھی ایسا نہیں ہوتا۔ جو اپنے گھر سے تھوڑا بہت واقف ہو اور اسلامی نظریات و خیالات کو سمجھ کر اجنبی ماحول میں قدم رکھتا ہو۔ وہ درسگاہوں میں سادہ طبیعت لے کر جاتے ہیں۔ مگر مغربی الحاد کے جراثیم لے کر واپس ہوتے ہیں۔ ہم ایسے بچے سکولوں کی نذر کرتے ہیں۔ جنکی دماغی سطح بہت صاف ہوتی ہے مگر وہاں پہونچتے ہی مغربی تعلیم کے نقوش اس پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ان کے سر میں فرنگی دماغ اس طرح اتار دیا جاتا ہے کہ پھر اس میں اسلامی نظریات کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور ان کی نگاہیں ہیگل۔ اسپنسر۔ ڈارون اور ڈیکارٹ کے سوا اور کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتیں حیرت یہ ہے۔ کہ ہمارے علماء کو خبر بھی نہیں۔ کہ وہ جس الحاد کا رونا رو رہے ہیں وہ کہاں سے آرہا ہے۔

ان تعلیمی خرابیوں کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں نے حکومت سے ہمیشہ یہ مطالبہ کیا کہ درسگاہوں میں اسلامی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ مگر آج تک اس طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اب سنا جاتا ہے کہ ہندوستان میں قومی حکومتیں قائم ہو گئیں ہیں۔ اور نصاب تعلیم میں بہت کچھ ردو بدل ہونے والا ہے اس لئے اگر ہم اپنے مطالبہ کا اعادہ کرتے ہوئے یہ عرض کریں تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ کہ سرکاری درسگاہوں میں مفکر علماء کے مشورہ سے مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے اگر اب بھی اس طرف توجہ نہ کی گئی۔ تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ آئندہ اس سے بہتر اور کونسا وقت آئیگا اور مسلمانوں کی اس خواہش کو کونسی حکومت پورا کرے گی

اے ہمنفس!

کیا اسی کو زندگی سمجھا ہے تو اے ہمنفس
بحرِ ہستی میں بہے جا ہیں مثالِ خار و خس

ذوقِ آزادی سے ہیں بیگانہ مرغانِ چمن
کچھ اسیرِ آشیاں ہیں کچھ گرفتارِ قفس

خاک کے ذرّوں پہ روشن کر گیا یہ اک شرر
عمرِ گمنامی سے بہتر ہے فروغِ یک نفس

طاقتِ پرواز اڑی ذوقِ پرافشانی گیا
بن گئے تیرے لئے اپنے ہی بال و پر قفس

تھا کبھی رنگِ مجاز آئینۂ اسرارِ حق
عشق کے پردے میں اب ہوتی ہے تعلیمِ ہوس

کیا بڑھائینگے کسی دامن کیجانب دستِ شوق
جن کی خود اپنے گریباں تک نہیں ہے دسترس

(اسدؔ ملتانی)

فہمِ قرآن

(حضرت مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

قرآن کریم کامل اور مکمل کتاب ہے اور اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی "نور مبین" رکھا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا۔ ۱۷۴/۴] اور ہم نے جگمگاتا نور تمہاری طرف اُتارا۔

نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور اردگرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے کہ وہ واضح، کھلا ہوا اور روشن ہے اور اپنی تشریح آپ ہے۔ اس کی تلاش کے لئے کسی روشنی کی ضرورت نہیں جس طرح آفتاب کو چراغ سے نہیں ڈھونڈھا جاتا۔ وہ دین و دنیا کے ان جملہ حقائق کی جن سے انسان کو ہدایت ملے اور قدیمی آسمانی کتابوں کی جملہ تعلیمات کی توضیح اور تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ۔ ۸۹/۱۶

اور ہم نے تجھ پر کتاب اُتاری جو ہر شے کی تشریح اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے۔

مَا کَانَ حَدِیْثًا یُّفْتَرٰی وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ ۱۱۱/۱۲

یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔

مَا کَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ الْکِتَابِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ ۳۷/۱۰

یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کو بنا لے بلکہ یہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے یہ رب العالمین کی طرف سے ہے

آیت بالا میں الکتاب سے مراد علم الٰہی ہے۔ جس کو قرآن میں جابجا اسی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتَابٍ ۷۰/۲۲

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ان سب چیزوں کا علم رکھتا ہے جو آسمان و زمین میں ہیں۔ بیشک وہ لکھی ہوئی ہیں۔

اس علم کو کتاب مبین فرمایا ہے۔

وَیَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمَاتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ۔ ۵۹/۶

وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کا علم رکھتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ ہے اور جو کچھ خشک و تر ہے وہ سب کتاب مبین میں ہے۔

اسی کتاب مبین کو اللہ نے عربی قرآن بنایا۔

وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔ ۴۳ | اور کتاب مبین شہادت دیتی ہے کہ ہم نے اس کو عربی بنایا تاکہ تم سمجھ سکو۔

کتاب مبین صحیفۂ فطرت ہے جو فعل الٰہی ہے۔ اب صحیفۂ فطرت فعل الٰہی اور کتاب مبین علم الٰہی اور قرآن کریم قول الٰہی۔ ان تینوں کی حقیقت کا متحد ہونا واضح ہو گیا۔ جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے اسی طرح قرآنی حقائق کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے اور انسانی نسلیں ان کو کبھی ختم نہیں کر سکتیں۔ اسی صلاحیت کی وجہ سے قرآن ہمیشہ کے لئے بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔

مزید توضیح کے لئے یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں اس قدر بدیہی فرق ہے کہ ہر انسان بلا کسی قسم کے ریب اور شک کے ان دونوں میں امتیاز کر لیتا ہے۔ مثلاً زمین۔ دریا۔ پہاڑ اور جنگل دیکھ کر سب کو یقین کے ساتھ علم ہو جاتا ہے کہ یہ فطرتی چیزیں ہیں۔ اور اگر زمین پر کوئی عمارت یا پہاڑ میں کوئی بت یا دریا میں کوئی کشتی یا جنگل میں کسی مشین کا ٹکڑا نظر آئے تو ہر شخص بلا اشتباہ کے سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی ساخت ہے۔ درخت پر سے گرا ہوا ایک پتا۔ گھاس میں سے جھڑا ہوا ایک تنکا۔ چیونٹی کا ٹوٹا ہوا ایک پاؤں۔ بھیڑ کا گرا ہوا ایک بال اگر سارے عالم کے ماہر اور کاردان کاریگر جمع ہو کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ یہی فرق اللہ کے کلام اور انسانی اقوال میں ہے۔

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا۔ ۸۸/۱۷ | کہدے اگر سارے جن و انس اس بات پر متفق ہوں کہ قرآن جیسا کلام بنائیں تو بھی ویسا نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔

لیکن معنوی حقائق چونکہ عقلی چیزیں ہیں اس لئے یہ فرق سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا۔ بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور یہی قرآن کا اعجاز ہے جو اہل بصیرت پر نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے آیات الٰہی کا موازنہ اقوال انسانی کے ساتھ کر کے اس کے اعجاز دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ حقیقت میں اعجاز قرآن کے سمجھنے سے بہت دور تھے۔

دوسرا فرق مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں یہ ہے کہ فطرتی اشیاء کے منافع اور تاثیرات کی کوئی معین حد نہیں ہوتی بلکہ ان کے متعلق جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہیں اسی قدر ان کے افعال و خواص معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ بخلاف انسانی مصنوعات کے کہ ان کی غرض و غایت متعین ہوتی ہے اور ان سے وہی نفع لیا جاتا ہے جس کو پہلے سے مدنظر رکھ کر وہ بنائی جاتی ہیں۔ یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک ماحول، ایک زبان یا ایک مکان کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ہر ماحول، ہر زمان اور ہر مکان میں انسان کا اشیاء فطرت کے متعلق جس قدر علم بڑھتا جائے گا اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائیں گے۔ اور قرآن بھی فطرتی اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا

تھکنے والا نہیں ہے۔ بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عہد صحابہ میں قرآن بالکل سمجھ لیا گیا اور اب ہم کو انہیں کی فہم پر قناعت کرنا چاہئے۔ وہ قرآن کی حقیقت سے آشنا نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا علم قرآن دیگر علمائے قرآن سے اس لحاظ سے افضل ہے کہ انھوں نے اس کے عملی پہلو کو اختیار کیا۔ اور جو کچھ سمجھا۔ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھایا اس کی حرف بحرف تعمیل کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف نظری کتاب نہیں ہے۔ بلکہ عملی بھی ہے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے سے ہی فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے صحابہ کا درجہ عملی لحاظ سے اس قدر افضل ہوا کہ ساری امت مل کر بھی ان کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن جو لوگ فہم قرآن کو ان روایات میں الجھانا چاہتے ہیں جو صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن کسی ایک ماحول کی کتاب نہیں ہے اگر کسی ایک زمانہ میں وہ بالکل سمجھ لیا گیا تو بس ختم ہو گیا اور آئندہ کے لئے نصاب نہیں رہا۔ لیکن وہ قیامت تک کے لئے نصاب ہے۔ اور ہر زمانہ میں نئی روشنی ہدایت کے لئے اس سے نکالی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں یہ روایات جن ذرائع سے آئی ہیں وہ اس قدر غیر یقینی اور مشتبہ ہیں کہ انُ پر قرآن جیسی قطعی اور یقینی چیز کی تشریح کا مدار رکھنا اس کی قطعیت کو کھونا ہے۔

یہ خیال بھی کہ اس زمانہ میں جب آیات نازل ہوئی تھیں لوگ ان کے شان نزول سے واقف تھے اس لئے انھوں نے اچھی طرح ان کو سمجھ لیا۔ دراصل قرآن کے متعلق اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک ہی زمانہ کی چیز ہے۔ قرآن کسی شان نزول یا موقع نزول یا واقعۂ نزول کا پابند نہیں ہے اور اس کی ہدایات مخصوص زمان و مکان سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ بالاتر ہیں۔

ہماری تمام تفسیریں آغاز عہد سے اب تک یعنی امام ابن جریر طبری سے مفتی محمد عبدہ تک اسی قدامت پرستی کے نظریہ کے ماتحت لکھی گئی ہیں اور ان کا انداز بھی شروع سے آج تک ایک ہی ہے۔ یعنی وہ سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اس طرح آیات اور الفاظ کی توضرور تشریح ہو جاتی ہے۔ مگر قرآنی مسائل اور حقائق سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ وہ مسلسل نہیں بیان کئے گئے ہیں۔ بلکہ مختلف سورتوں اور آیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے قرآن فہمی کے لئے یہ تفسیریں زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ ان تمام تفسیروں کا جو مفید حصہ ہو سکتا ہے تقریباً اسی قدر ہے جس کو راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات میں جمع کر دیا ہے۔ بقیہ جو کچھ ہے وہ سلف کی آیات فہمی کی تاریخ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اپنی شرح آپ ہے۔ اس کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ۔ ۱۹/۷۵] پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

آیات قرآنی بیشتر محکم ہیں یعنی ان کے معانی قطعی اور متعین ہیں۔ تھوڑی سی متشابہات ہیں جن کے حقائق انسان کی علمی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات۔ صفات۔ جنت۔ دوزخ اور میزان عمل وغیرہ جن کو تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قرآن نے بیان کیا ہے اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔

محکم آیات جوام الکتاب اور اصل قرآن کہی گئی ہیں ان کی تفصیلات اللہ ہی کی طرف سے کی گئی ہیں۔

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ۱۱/۱	(یہ مکمل) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے

یہ تفصیل علم کے ساتھ کی گئی ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ۵۲/۷	ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے۔

اسی لئے قرآن کو کتاب مفصل کہا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۱۱۴/۶	اور وہی اللہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ

یہ تفصیل اہل علم اور اہل فہم کے لئے ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۹۷/۶	ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کیلئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں۔
قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۹۸/۶	ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو فہم رکھتے ہیں۔

جس قدر انسان کا علم حقائق فطرت کے متعلق بڑھتا جائے گا۔ اسی قدر وہ قرآنی تعلیمات کی تفصیلات زیادہ سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اگر معانی سمجھنے میں اختلافات واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جس طرح کہ اشیاء فطرت کے محققین میں کبھی کبھی نظریوں کا اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ لیکن مزید غور و فکر سے رفتہ رفتہ آخر کار وہ مٹ جاتا ہے اور سب کے سب ایک حقیقت پر پہنچ کر متحد الخیال ہو جاتے ہیں۔

قرآنی آیات جو اکثر بہ تبدیل الفاظ و عبارات جابجا اُلٹ پھیر کے بیان کی گئی ہیں۔ ان میں ان کی تشریح مضمر ہے۔

وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۱۰۵/۶	اور اسی طرح ہم آیتوں کو ہیر پھیر کے لاتے ہیں تاکہ وہ کہدیں کہ تونے پڑھکر سنا دیا اور تاکہ ہم اہل علم کیلئے اس (قرآن) کی تشریح کردیں۔

الغرض قرآن کریم ایسی جامع اور کامل کتاب ہے کہ اس کی آیات۔ الفاظ اور تعلیمات کی تشریح، توضیح اور تفصیل سب اس کے اندر ہے۔ اور سمجھنے کے قاعدے اور ضوابط بھی بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جن کو انشاء اللہ ہم آئندہ لکھیں گے۔

دینِ فطرت

(از چوہدری غلام احمد پرویز بی اے)

حیات ایک مسلسل شئے ہے اور جمادات سے انسان تک کی مختلف صورتیں اس حیات کے سلسلۂ ارتقاء کی متنوع کڑیاں ہیں۔ جمادات کی زندگی ہیں۔ جہانتک جدید معلومات کا تعلق ہے۔ اختیار و ارادہ تو کجا۔ نشو و نمو کی اہلیت بھی مشکوک ہے۔ نباتی زندگی میں نشو و ارتقا ہے۔ لیکن ان میں اختیار و ارادہ مشکوک ہے اس سے آگے بڑھیئے تو عام حیوانات میں نشو و نما کے ساتھ ایک حد تک اختیار و ارادہ بھی شامل ہے لیکن صرف اتنا ہی کہ وہ اپنی طبعی ضروریات کے لیے ارتباط جسم و جاں کی خاطر۔ یہاں وہاں چل پھر سکیں۔ پیاس لگے تو کسی جوہڑ کیطرف رُخ کرلیں۔ بھوک لگے تو چراگاہ کی جانب قدم اُٹھ جائیں گرمی ستائے تو کسی درخت کے نیچے سستانے کو ٹھہر جائیں اس سے زیادہ۔ شعور و ادراک تو ایک طرف رہا۔ اچھے اور بُرے کے امتیاز کو بھی اُنکے اپنے ارادہ پر نہیں چھوڑا۔ کون سی شئے اُنکے مناسب حال ہے اور کون سی مُضر، کون سی حیات بخش ہے اور کون سی ہلاکت آفریں۔ یہ سب امتیازات اُن کی فطرت میں ودیعت کرکے رکھ دیے گئے ہیں۔ اور وہ ان غیر شعوری امتیازات کی پابندیوں پر مجبور کردیے گئے ہیں۔ ایک شیر جنگل میں بھوکوں مرجائے گا۔ لیکن گھاس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ حالانکہ وہ میلوں اُس کے گرد و پیش پھیلی ہوگی۔ ایک بکری سوکھ کر کانٹا ہوجائیگی۔ لیکن کبھی گوشت کو منہ نہیں لگائے گی۔ ایک بطخ کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی پانی کیطرف دوڑے گا۔ لیکن ایک مُرغی کا بچہ جو اسکے ساتھ کھیلتا ہو۔ کبھی پانی کا رُخ نہ کرے گا۔ ان اُمور میں یہ سب مجبور ہیں۔ مختار نہیں ہیں۔ ان کے اپنے ارادوں کو اسمیں کچھ دخل نہیں۔ حیوانات سے آگے بڑھیئے تو انسانی زندگی شروع ہوتی ہے۔ ان میں نباتات کی سی نشو و نما کی اہلیت اور حیوانات کی سی طبعی ضروریات کے لیے تجسس و کاوش کی تڑپ موجود ہے۔ لیکن ان سب سے جُداگانہ انسان کو چیزوں کے امتیاز میں اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اور یہی شعور و ادراک۔ یہی قوتِ امتیاز۔ یہی ارادہ و اختیار، انسانی زندگی کو سلسلۂ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں سے ممتاز کرتا ہے اور اسی ادراک اور قوتِ تمیز

کی خصوصیت کی وجہ سے اس پر تمام ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ایک بکری بے شک گوشت کو منہ نہ لگائے گی۔ لیکن اُسے اس بات کی تمیز قطعًا نہ ہوگی کہ وہ گھاس اپنے ہی مالک کے کھیت سے چرے۔ دوسرے کے کھیت سے نہ کھائے۔ یہ امتیاز انسان ہی سے شروع ہوتا ہے کیونکہ وہ فطرۃً مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اور عمرانی اور تمدنی حدود بندیوں کی ضرورت بھی اسی وقت پڑتی ہے جب انسانوں کو مل جُل کر زندگی بسر کرنی ہو۔ جب ایک دوسرے کے ساتھ واسطہ پڑتا ہو۔ جہاں تک انسان کی طبعی ضروریات کا تعلق ہے اسکی عقل اور عقلی نتائج کا مجموعی اثر۔ جسے تجربہ کہتے ہیں۔ اس بات کے امتیاز میں ایک حد تک اسکی رہبری کر سکتے ہیں کہ کون سی چیز ممدِ حیات ہے اور کون سی مہلک سنکھیا اور نمک کے اثرات میں امتیاز اسکے مشاہدہ اور تجربہ نے ہی کیا ہے ورنہ طبعی طور پر تو انسان کے بچے کے ہاتھ میں سنکھیا اور مصری کی ڈلی دیدیجئے وہ دونوں کو اُٹھا کر منہ میں ڈال لیگا لیکن ان اُمور میں جن کا تعلق نظام جسمانی سے ماورا ہے۔ تنہا عقل اسکی صحیح رہبری نہیں کر سکتی اس لیئے کہ عقل ہمیشہ جذبات کے تابع رہتی ہے۔ پروفیسر جوڈ۔ جس کا شمار علم النفس کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ اپنی کتاب (Guide to Modern Thought) میں لکھتا ہے کہ:۔

"عقل" درحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو مقاصد ہم غیر شعوری طور پر حاصل کرنے کی خواہش کریں۔ انکے حصول کے لیئے ذرائع بہم پہنچا دے۔ اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اُسکے جواز کے لیئے دلائل تلاش کر کے مہیا کر دے۔"

اور دُنیا میں جس قدر فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے محض اسلیئے کہ ہر شخص۔ اور اشخاص کے مجموعہ یعنی قوم۔ کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ دُنیا اُن کی مرضی کے تابع چلے۔ یعنی اُن کے جذبات بڑے کار آنے میں کوئی چیز مزاحمت نہ کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیئے پھر وہ عقل کو آلۂ کار بناتے ہیں جس کی "ہنرمندی" زیادہ چلتی ہے۔ وہی غالب آجاتا ہے۔ جب حالت یہ ہے تو ظاہر ہے کہ تنہا عقل انسان کی کیا رہبری کرے گی۔ انسان کی سرکشی کا تو یہ عالم ہے کہ نظام جسمانی میں بھی جن اُمور پر عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ یہ ہلاکت آفریں ہیں۔ جب اسیر جذبات غالب آتے ہیں تو یہ اس حکم اور اس فیصلہ کی قطعًا پروا نہیں کرتا۔ اور کرتا وہی ہے جو اُسکے جی میں آتا ہے۔ حالانکہ یہ وہ اُمور ہیں جن میں قانون شکنی کی سزا فورًا ملجاتی ہے۔ دُنیا میں جس قدر بیماریاں ہیں سب اسی قانون شکنی کا نتیجہ ہیں۔ اور مشاہدہ

بتا رہا ہے کہ انسان جس قدر مہذب ہوتا جا رہا ہے یہ امراض یعنی قانون شکنی کی وارداتیں، بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ اور عقل سے صرف اتنا کام لیا جا رہا ہے، کہ وہ ان امراض کا علاج۔ یعنی اس مکافات عمل کے نتائج کا ازالہ کر دے۔ جب طبعی امور میں انسان کی یہ کیفیت ہے تو نظام جسمانی سے ماوراء امور ہیں۔ جنہیں۔ تمدنی۔ معاشرتی۔ سیاسی۔ معاشی امور کہہ لیجئے۔ تنہا عقل اس کی کیا دستگیری کر سکتی ہے بالخصوص اس لئے کہ ان امور میں قانون شکنی کے نتائج بڑے غیر محسوس اور دیر کے بعد نمودار ہوتے ہیں بسنکیا جائیے۔ ڈومنٹ میں فیصلہ ہو جائے گا لیکن جھوٹ بولنے والے کو احساس بھی نہ ہو گا کہ اُسے کوئی ہلاک کر دینے والا کام کیا ہے تو سب سے بڑی چیز جو انسان کو صحیح راستہ پر چلنے سے روکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسکے جذبات، عقل یا فطرت سلیمہ پر غالب آ جاتے ہیں، جذبات کا قائم رہنا بھی ضروری ہے اور اُن کا قائم رکھنا بھی۔ لیکن اعتدال کا راستہ یہ ہے کہ انہیں فطرت سلیمہ کے تابع رکھا جائے اس پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ قرآن کریم نے۔ مثلاً۔ اسی لئے مومنین کی تعریف کی ہے کہ وہ کاظمین الغیظ ہوں گے یعنی غصہ کو دبا لینے والے۔ فنا کر دینے والے نہیں۔ اسے فطرتِ صحیحہ کے تابع رکھنے والے۔ صحیح راستہ پر چلنا اُس کی فطرت میں داخل رہتا صحیح اور مناسب چیزوں کا استعمال اور غلط چیزوں سے اجتناب عام حیوانات کی فطرت میں داخل تھا لیکن برعکس حیوانات کے۔ انسان کے سینہ میں فطرت اور جذبات کے درمیان ایک کش مکش جاری رہتی ہے۔ اس کا قلب اس کش مکش پیہم کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ یہ دو قوتیں ہر وقت برسرِ پیکار رہتی ہیں جب فطرت غالب آ جاتی ہے، تو انسان کا قدم اس منزل کی طرف بڑھ جاتا ہے جسکے حصول کے لئے یہ پیدا کیا گیا ہے جب جذبات غالب آ جاتے ہیں تو یہ منزلِ مقصود سے ایک قدم اور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اُس کی منزل مقصود کیا ہے! اسے ہم کسی دوسرے وقت بیان کرینگے۔ اسوقت صرف اس قدر پیش نظر رکھنا کافی ہو گا کہ وہ سلسلۂ ارتقاء جو بتدریج بڑھتے بڑھتے انسان تک پہنچا۔ انسان پر آکر ختم نہیں ہو جاتا اسے ابھی بہت آگے چلنا ہے۔ اس سلسلۂ ارتقاء میں انسان کی موجودہ زندگی کے بعد کی کڑی اُس کی اگلی منزل ہے۔ نظریۂ ارتقاء کا یہ اٹل قانون ہے کہ باقی رہنے اور پھر آگے بڑھنے کے لئے اصلح (The fittest) ہونا ضروری ہے۔ یہ جہد للبقاء (Struggle for existence) آگے بڑھانے والی اور پیچھے ہٹانے والی دو قوتوں کے درمیان جنگ کا نام ہے، یہی دو قوتیں جنہیں

ہم نے فطرت اور جذبات کہا ہے۔ جن کا نام قرآن کریم نے نفسِ لوامہ اور نفسِ امّارہ رکھا ہے جب نفس امّارہ غالب آجاتا ہے تو انسان کا قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ جب نفس لوامہ جیت جاتا ہے تو وہ آگے بڑھ جاتا ہے اور اس کش مکش کے بعد اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ اسی کیفیت کی آخری منزل کا نام نفسِ مطمئنہ ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ

۹۵

ہم نے انسان کو بہترین ہیئت کذائی میں پیدا کیا۔ پھر اسے نیچے نیچے کے درجہ میں لوٹا دیا۔ مگر ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے اعمال صالح کیے پس اُن کے لیے غیر منقطع اجر ہے۔

نچلے درجہ میں جا پہنچنا رجعتِ قہقری ہے۔ پیچھے کیطرف ہٹنا ہے۔ جذبات کا غالب آجانا قانون ارتقار کے مطابق اس معرکۂ جہد للبقار میں شکست کھا جانا ہے۔ اسکے خلاف فطرت کا غالب آجانا گویا اصلح بنجانا ہے۔ اسی لیے ایسے اعمال کو قرآن کریم نے اعمال صالح کہا ہے یعنی ایسے اعمال جو انسان کو اصلح (The fittest) بنا دیں جو اسکے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ یہی کامیابی ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔

۹۱

اور قسم ہے نفس انسانی کی اور اس کی جسنے اُسے ریوں اکمل کیا ریا غور کرو نفس انسانی میں اور اس ذات میں جسنے اُسے یوں سنوارا) پھر اسمیں ر؟ سے ہٹ جانے اور ایسے اُمور سے بچ جانے کی تیز ودیعت کرکے رکھ دی۔ یقیناً کامیاب ہوگا۔ وہ جس نے اس نفس کو جذبات کے غلبہ سے بچا رکھا اور شکست کھا جائے گا وہ جس نے اس نفس کو جذبات کے نیچے دبا دیا

فطرت صحیح انسان کے اندر ودیعت کرکے رکھ دی گئی ہے۔ لیکن اس فطرت کے خلاف کیا کیا قوتیں غیر محسوس طور پر کارفرما ہوتی ہیں اس کی تفصیل کے لیے ہمیں علم تجزیۂ نفس (Psycho-analysis) کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ علم اہل یورپ کے سامنے ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وی آنا کے مشہور ڈاکٹر فرائڈ (Freud) نے اس کی سائنٹفک طریقہ سے ابتدا کی ہے۔ اور اسکے شاگرد۔ لیکن ایک جداگانہ نظریے کے امام۔ ایڈلر (ADLER) نے اسے کسی حد

تک عام فہم بنانے کی کوشش کی اُس نے اپنی کتاب (Understanding Human Nature) میں شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ اس فطرت انسانی کے خلاف کیا کیا قوتیں کام کرتی ہیں۔ اسکی تحقیقات کے مطابق تو انسان کی فطرت صحیحہ کا بہت بڑا حصہ اسوقت سے پیشتر ہی خارجی پردوں میں چھپ جاتا ہے جب بچہ بولنا سیکھتا ہے۔ وہ اپنے گہوارہ میں لیٹے لیٹے آنکھوں ہی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش کے نقوش اس شدت سے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے کہ وہ گویا پتھر کی لکیریں بن جاتے ہیں۔ یہ ماحول کا اثر۔ سوسائٹی کے قوانین۔ کہنہ روایات۔ خاندانی رواج۔ نسلی رجحانات۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اگر فرائڈ کے ایک دوسرے شاگرد ڈاکٹر جونگ (Jung) کا نظریہ درست تسلیم کر لیا جائے۔ تو اسکی جسمانی ساخت اور اُس میں مختلف اخلاط کا تناسب۔ یہ سب کچھ اسکی فطرت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ فطرت ان تمام مخالف قوتوں کے اس ہجوم کا کسطرح مقابلہ کریگی۔ اور تنہا عقل اسکی کیا رہبری کریگی جو خود جذبات کی غلام بنکر رہ جاتی ہے۔ فطرت صحیحہ باوجود ان تمام زنجیروں کے خطرے سے آگاہ ضرور کرتی رہتی ہے۔ جونہی جذبات (نفس امارہ) ابھرنے شروع ہوئے۔ انسان کا قدم صحیح راستہ سے ڈگمگایا۔ اور اسے (نفس لوامہ) نے للکارا۔ لیکن اگر جذبات غالب آتے رہیں تو رفتہ رفتہ اسکی آواز بھی دب جاتی ہے۔ اور اگر ایک مدت تک یہ کیفیت جاری رہے تو یہ بیچاری بالکل بھولی بسری ہو جاتی ہے۔ اس حالت کا نام قرآن کریم کی اصطلاح میں فسق ہے فرمایا۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝

اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا۔ تو اللہ نے (اس جرم کے فطرتی نتیجہ کے مطابق) انکی فطرت (نفس) کو ان سے بھلا دیا۔ (فطرت صحیحہ بھولی بسری ہو گئی) یہ لوگ فاسقین ہیں۔

گویا انسان کو اس کے صحیح راستہ پر قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسکی فطرت اگر بالکل خاموش کر دی گئی ہے۔ تو اسکی یاد تازہ کر دی جائے۔ اگر وہ خارجی اثرات کے پردوں میں چھپ کر غافل ہو چکی ہے۔ تو اسے بیدار کر دیا جائے۔ اگر وہ اخلاط فاسدہ کے امتزاج سے نحیف و کمزور ہو چکی ہے تو اسمیں دوبارہ قوت پیدا کر دی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرے کون؟

ظاہر ہے کہ تنہا عقل اس کام کو نہیں کر سکتی کہ اسکی بے بسی ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ (اور ہر روز دیکھ رہے ہیں) نہ کوئی انسان اپنی طرف سے ایسا کر سکتا ہے کہ انسان کبھی جذبات سے خالی نہیں ہو سکتا۔ جو ایسا ہونے کے مدعی ہیں یا اسکی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لہذا اس کے لئے ہمیں ضرورت ہے کہ کوئی ایسی "عقل کل" ہو جس پر

جذبات غالب نہ آسکیں۔ کوئی ایسی ہستی ہو جو ان "جذبات" سے ماورا ہو۔ اس بیرونی قوت کا نام ہے وحی۔ خدا کی طرف سے ہدایات۔ اور ان ہدایات کے مکمل ضابطہ کا نام ہے قرآن۔ (یہ مکمل کیونکر ہے۔ اس کے لئے کسی دوسرے مضمون کا انتظار کیجئے۔) قرآن کریم نے ان لوگوں کی بابت جو صحیح راستہ سے ہٹ جاتے ہیں فرمایا ہے۔ کہ

علیٰ قلوبھم اکنّۃ۔ ان کے دلوں پر پردے ہیں۔ پردے ہٹا دیجئے۔ قلب اپنا صحیح کام کرنے لگ جائیگا۔ دوسری جگہ ہے۔

ام علیٰ قلوبھم اقفالھا۔ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ تالے کھول دیجئے۔ قلب آزاد ہو جائیگا۔ کہیں ہے کہ وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ ان کی آنکھوں پر پردے ہیں۔ کہیں وفی اذانھم وقرا۔ کہ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ رہی ہے۔ یہ دلوں کے غلاف اور تالے۔ یہ آنکھوں کے پردے۔ یہ کانوں کی ڈاٹ وہی خارجی اثرات ہیں جو فطرت صحیحہ کو اپنے نیچے دبا لیتے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ فطرت اپنا کام نہیں کرسکتی۔ دب جاتی ہے۔ سو جاتی ہے اور کبھی یوں سمجھئے کہ مر ہی جاتی ہے۔

ھم فی غفلۃ معرضون۔ اور لوگ (فطرت کی اس) غفلت کی وجہ سے روگردانی کرتے ہیں صحیح راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ فطرت کو جن غیر فطری اثرات نے گھیر رکھا ہے۔ اسپر پردے ڈال رکھے ہیں۔ اسے محبوس کر رکھا ہے۔ قرآن کریم کا منصب یہ ہے کہ ان اثرات کو الگ کر دے۔ فطرت آزاد ہو جائیگی۔

آنکھ کا اپریشن کیا ہے۔ یہی کہ جو جھلی آنکھ کی پتلی پر آچکی ہو۔ یا جو پانی اسکے اندر جمع ہو کر اسکے فعل کو روک رہا ہو۔ اسے نوک نشتر سے الگ کر دیا جائے۔ بینائی خود بخود آجائے گی۔ لیکن یہ بینائی کہیں باہر سے نہیں آئیگی۔ انجکشن کے ذریعہ سے داخل نہیں کی جائیگی۔ بلکہ پردہ اٹھ جانے سے آنکھ خود بخود اپنا کام کرنے لگ جائیگی۔ بس اسی کا نام بینائی کا عود کر آنا ہے۔ آنکھ کا آزاد ہو جانا ہے۔ قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد عظیم یہی قرار دیا ہے کہ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم یعنی نوع انسانی (فطرت صحیحہ) جس بوجھ کے نیچے دب چکی ہے وہ اسے اس بوجھ سے آزاد کر دینگے۔ وہ جن زنجیروں میں جکڑی جا چکی ہے ان زنجیروں کو توڑ دینگے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے رسولوں کو نذیر کہا ہے۔ انذار کے معنی ہیں آگاہ کرنا۔ بیدار کرنا۔ سونے والے پر غفلت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اسے بیدار کرنیوالا ہشیاری اور آگہی کہیں باہر سے لا کر اسکے اندر داخل نہیں کرتا۔ بلکہ کرتا یہ ہے کہ اسے جھنجھوڑ کر غفلت کی خواب اچھال دیتا ہے۔ بیداری خود بخود پیدا ہو جاتی ہے پیدا بھی کیا ہوتی ہے

بس اپنا چھوڑا ہوا کام کرنے لگ جاتی ہے قرآن کریم نے اپنے آپ کو تذکرہ کہا ہے۔ ان ھٰذہٖ تذکرۃ تذکیر کے معنی ہیں کسی بھولی ہوئی بات کو یاد دلا دینا۔ جو شخص کسی بات کی یاددہانی کراتا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں بتاتا۔ بلکہ وہ بات فوراً اس بھولنے والے کے اندر موجود ہوتی ہے۔ صرف نسیان کا پردہ اٹھا دینا ہوتا ہے وہ گم گشتہ بات خود بخود سامنے آجاتی ہے کہیں ان لوگوں کے متعلق جو صحیح راستہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ کہا ہے کہ فی قلوبھم مرض۔ انکے دلوں میں بیماری ہے اور اسکے علاج کے لیے فرمایا کہ قرآن کریم شفاء لما فی الصدور ہے۔ دل کے امراض کے لیے شفا ہے۔ بیماری کے معنی یہ ہیں کہ فطرت اپنا صحیح کام نہیں کر رہی ہوتی۔ اس پر غیر فطری اسباب و علل کا غلبہ چھا جاتا ہے۔ اور شفا کے یہ معنی ہیں کہ ان خارجی اثرات کا غلبہ دور کر دیا جائے۔ شفا کہیں باہر سے نہیں آتی بلکہ نظام جسمانی پر جو غیر فطری اثرات چھا جاتے ہیں انکے دور کرنے کا نام ہی شفا ہے یعنی اس نظام طبعی کو اپنی اصلیت پر لے آنے کا نام شفا ہے۔ قرآن کریم بھی یہی کرتا ہے کہ فطرت صحیحہ پر جو غیر فطری اثرات غلبہ پالیتے ہیں انہیں دور کر کے فطرت کو آزاد کر دیتا ہے کہ وہ جس غرض کے لیے پیدا کی گئی تھی۔ اسے صحیح طور پر سرانجام دے سکے۔ یہ ہے دین فطرت

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا | اللہ کا وہ قانون فطرت جس پر نوع انسانی کو پیدا کیا گیا ہے

اس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن کریم جس راستہ پر چلنے کا حکم دیتا ہے وہ راستہ وہ ہے جس پر چلنے کے لیے فطرت انسانی کو پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ خارجی اثرات فطرت کو اس راستہ پر چلنے سے روکے رکھتے ہیں۔ اس لیے جب فطرت اور جذبات میں باہمی کش مکش پیدا ہو اور آپ فیصلہ نہ کرسکیں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیئے۔ اور فیصلہ بھی کس طرح کرسکتے ہیں کہ فیصلے ہوتے ہیں عقل کے زور پر۔ اور عقل بیچاری خود جذبات کے تابع ہو چکی ہوتی ہے۔ تو اسوقت آنکھ بند کر کے وہ کچھ کر دیجئے جس کا حکم قرآن دیتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ مخالف قوت (شیطان) کو شکست ہو جائے گی۔ اور فطرت آزاد ہو کر اپنے راستہ پر چلنے لگے گی اور نہایت اطمینان سے اپنے فرائض پورے کرنے میں منہمک ہو جائے گی۔ اب آپ کا قدم آگے کو اٹھے گا۔ آپ ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس "آنکھ بند کر کے" گزرنے کا نام "ایمان بالغیب" ہے۔ اسکے بغیر چارہ نہیں۔ کہ اگر اس کش مکش کے وقت آپ نے عقل کی رو سے جھگڑنا شروع کیا تو عقل چونکہ جذبات کی ہی ترجمانی کر رہی ہوگی۔ آپ کو فطرت کا صحیح راستہ بھی غلط نظر آئے گا۔

اُسوقت جذبات اور اُن کے وکیلوں کا کہنا مت مانیئے۔ اور قانونِ فطرت کے مطابق (قرآن کریم کے مطابق) قدم اُٹھالیجئے۔ جب اس طرح عقل پر سے جذبات کا غلبہ اُٹھ جائے گا۔ عقل اپنی آنکھ سے حقائق کو پرکھنے کے قابل ہو جائے گی۔ تو یہ خود گواہی دیدے گی کہ یہ قدم فی الحقیقت عقل کے عین مطابق تہا۔ مخالف نہ تہا۔ وہ تو جذبات نے عقل کا نقاب اوڑھ رکہا تھا۔ جو تمہیں اسوقت کہہ رہے تھے کہ یہ قدم خلاف عقل ہے۔ دین فطرت کبھی خلاف عقل نہیں ہو سکتا۔ اسی لیئے دین فطرت کیطرف دعوت دینے والے نے پکار پکار کر کہہ دیا ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی میں اور میرے متبع جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے رہے ہیں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں۔ عین علم و بصیرت۔ عقل و شعور کے مطابق دعوت دیتے ہیں کوئی بات خلاف عقل نہیں پیش کرتے۔ بلکہ ہمارا تو کام یہ ہے کہ عقل و فطرت کو ان خارجی اثرات سے آزاد کر کے اُنہیں پوری طرح اپنے کام کرنے کے قابل بنادیں یہ ہے دینِ فطرت۔ جسے عالم اسلامی کے مفکر اعظم علامہ اقبال مدظلہٗ احساس خودی سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اور جس کی ابجد خوانی یورپ میں حال ہی میں شروع ہوئی ہے اور جسکے متعلق اس مکتب کے مرشد فرائڈ کا قول ہے کہ :۔

(سب سے آخری بات جو ایک انسان معلوم کرنا اور سمجھنا چاہتا ہے وہ اس کی اپنی ذات ہے
(نفس) ہے۔ خودی ہے۔ فطرت ہے۔)

اور یہ سوائے قرآن کریم کے اور کہیں سے نہیں سیکھا جا سکتا۔ یورپ اِدہر اُدھر کے ناکام تجربات کے بعد اب رفتہ رفتہ قرآن کی طرف آرہا ہے اور آگے رہے گا کہ اُسکے بغیر چارہ نہیں۔ حقائق اور کہیں دُنیا میں مل نہیں سکتے۔ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ

سنریھم ایٰتنا فی الآفاق وفی انفسھم
حتیٰ یتبین لھم انہ الحق

کہ ہم انسانوں کو اپنی نشانیاں اس نظام کائنات میں اور خود اُنکی ذات (نفس) کے اندر دکہا دینگے حتیٰ کہ اُن پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائیگی کہ قرآن ہی حق ہے

نظام کائنات کی آیات دیکھی جارہی ہیں۔ اور یورپ خواہ زبان سے اس بات کا اقرار نہ کرے لیکن دل میں جانتا ہے کہ ہر انکشاف کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جو قرآن کریم کے اندر پہلے سے موجود ہے۔ اب "فی انفسہم" کیطرف آرہا ہے اور یہاں بھی اُسے معلوم ہو جائیگا کہ حقیقت وہی ہے جو قرآن کریم کہتا ہے کہ قرآن دین فطرت کا ضابطہ ہے۔ کسی انسان کی قیاس آرائیوں کا مجموعہ نہیں۔ وذالک الدین القیم۔

جوئے رواں:- "ادارہ"

قرآن کریم کے متعلق

ایک گرانبہا اور عظیم الشان کتاب جو ایک صاحب نظر، قرآن فہم کے عمر بھر کے غور و تدبر کا ماحصل اور سالہا سال کی پیہم دیدہ ریزی اور جگر گدازی کا نتیجہ ہے۔

طلوع اسلام کے

آخری جزو پر مختلف عنوانوں کے ماتحت مسلسل شائع ہوگی۔

ہر عنوان

فی ذاتہ مکمل بھی اور ایک سلسلۂ دراز کی متعدد کڑیوں کی طرح باہمد گر پیوست بھی۔ اس کتاب کو

قرآنی دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا)

سمجھئے۔ جس میں سینکڑوں عنوان ہیں اور ہر عنوان کے تحت قرآن کریم کی تعلیم ایک مربوط مضمون کی صورت میں اس انداز سے ترتیب دی گئی ہے کہ قرآن کریم خود بخود سمجھ میں آتا چلا جائے اور ایسا سمجھ میں آئے کہ اس سے نگاہوں میں بصیرت۔ ذہن میں جلا اور قلب میں تسکین و طمانیت کا نور پیدا ہو جائے۔

آئندہ پرچہ میں

اس گرامی قدر کتاب کا تفصیلی تعارف ملاحظہ فرمائیے۔ اور اس کے بعد اس کا سلسلہ مربوط و متصل

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
این کتابے نیست چیزے دیگر است

نظریۂ قومیت
کتاب وسنّت کی روشنی میں

راذی

احوال وظروفِ زمانہ کی ستم ظریفی بھی بعض اوقات داد کے قابل ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے ایسی ایسی چیزیں جو مسلّمات میں سے تسلیم ہوتی چلی آتی ہیں معرکۂ بحث میں آجاتی ہیں اور اُن کو پھر سے مسلّمات کی شق میں لانے کے لیے مخالف وموافق دلائل کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اسی قسم کی ستم ظریفی کی تازہ مثال وہ نظریۂ قومیت ہے جو حضرت مولانا حسین احمد دیوبندی مدظلہٗ نے پیش کیا ہے، اور جو کچھ عرصہ سے ہر سوچنے والے کے لیے جاذبِ توجہ بن رہا ہے۔ اس نظریہ کا اعلان حضرت مولانا نے دہلی کی ایک تقریر میں کیا۔ جب تک بات ہوا میں رہی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ خدا جانے انھوں نے کیا کہا اور دوسروں نے کیا سمجھا۔ مولانا کے تبحرِ علمی کے ارادتمند یہ کہہ کر دل کو سمجھاتے رہے کہ جو کچھ اُن کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے محض پروپیگنڈا ہے حقیقت کچھ اور ہوگی لیکن اس خوش فہمی نے زیادہ دیر تک ساتھ نہ دیا اور جب مولانا نے اخبارات میں ایک مفصل اور مبسوط بیان شائع کرا دیا تو صاف صاف معاملہ سامنے آگیا۔ اسوقت میرے سامنے ۱۲ فروری ۱۹۳۸ء کا اخبار مدینہ ہے جس میں یہ بیان چھپا ہے۔ حضرت مولانا کے نظریہ کے عناصر ترکیبی یہ ہیں جو انہی کے الفاظ میں لکھے جاتے ہیں۔

(۱) موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل اور مذہب سے۔

(۲) قوم کا اطلاق ایسی جماعت پر کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت کی موجود ہو۔ خواہ وہ مذہب ہو یا وطنیت۔ یا نسل۔ یا پیشہ یا رنگت یا اور کوئی صفتِ معنوی یا مادّی وغیرہ وغیرہ

(۳) یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسان اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے (جیسا کہ مدیر احسان کا دعویٰ

ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کون سی نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔

اب بات صاف ہوگئی کہ حضرت مولانا کے نظریے کے مطابق۔

(۱) مختلف افراد کے ایک قوم بننے کے لیے کوئی وجہ جامعیت۔ کوئی قدرِ مشترک (Common factor) ہونا ضروری ہے۔

(ب) یہ وجہ جامعیت مذہبیت ہو سکتی ہے' وطنیت ہو سکتی ہے وحدتِ نسل یا پیشہ وغیرہ ہو سکتی ہے یعنی ان میں سے کوئی ایک وحدت۔ کسی امر میں اشتراک۔

(ج) کبھی یہ وجہ جامعیت مذہبیت بھی ہوتی تھی۔ لیکن۔

(د) موجودہ زمانہ میں یہ وجہ جامعیت اوطان (وطن) کی وحدت ہے، یعنی ایک وطن کے رہنے والے ایک قوم ہوتے ہیں

یہ ہے حضرت مولانا کے نظریۂ قومیت کا تجزیہ اگر یہ نظریہ حضرت مولانا کی محض ذاتی رائے ہوتی تو ہمیں اس سے چنداں سروکار نہ تھا۔ لیکن چونکہ انھوں نے فرمایا ہے کہ انھیں اس نظریہ کے خلاف کوئی "نصِ قطعی یا ظنی" نہیں ملتی۔ اور یہ دعویٰ ایک ایسی ہستی کی طرف سے ہے جس کا دین کے معاملہ میں ہر لفظ ایک کثیر طبقہ میں فتوے کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر:

اگر خاموش بنشینم گناہ است

آیئے تو ہم بھی دیکھیں کہ اس نظریے کے خلاف واقعی کوئی نصِ قطعی یا ظنی موجود نہیں ہے۔ واضح رہے کہ نہ مجھے حضرت مولانا کے سیاسی مسلک سے کچھ واسطہ ہے نہ میں اُسے اس بحث میں لاؤنگا۔ میرے سامنے تو یہ نظریہ ایک تحقیقاتی مسئلہ کی حیثیت سے ہے اور ہمیں دیکھنا ہے کہ قرآن و سُنت کی بارگاہ سے ہمیں اس اہم دینی معاملہ میں کیا فیصلہ ملتا ہے۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلّا بِاللہ

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں نہ کہ نسل و مذہب سے یعنی انہیں خود تسلیم ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی تھا جب قومیتیں مذہب سے بھی بنا کرتی تھیں یعنی وہ افراد جن میں وجہ جامعیت۔ قدرِ مشترک۔ مذہب ہوتی تھی۔ ایک قوم بنجاتے تھے۔ لیکن اب وہ زمانہ لد گیا۔ اَب دَورِ حاضرہ کی چمکتی ہوئی تہذیب نے ان دقیانوسی خیالات کو نئے نئے

نظریوں سے بدل دیا۔ اور موجودہ زمانہ میں قوم کے لیے وجۂ اشتراک وطن قرار پایا گیا ہے، کیا حضرت مولانا فرمائینگے کہ وہ کون سا دَور تھا جس میں قوم کے لیے وجۂ جامعیت مذہب تھا۔ انسانیت کی تاریخ میں وطن۔ نسل۔ رنگ۔ زبان۔ حکومت وغیرہ کی وحدت سے اقوام کی تشکیل کی مثالیں آپ کو بکثرت ملیں گی۔ لیکن دُنیا کے کسی حصّہ میں اور تاریخ عالم کے کسی دَور میں حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہیں مذہب وجۂ جامعیت نہیں ملتا۔ قرآن کریم میں قوم عاد۔ قوم ثمود۔ قوم لوط۔ قوم بنی اسرائیل۔ قوم فرعون۔ سب اقوام میں وجۂ اشتراک نسل یا وطن تھا۔ وہ عام طور پر قبائلی زندگی کا زمانہ تھا۔ انسانیت کی طفولیت کا وقت تھا۔ قوموں میں وجۂ جامعیت نسل یا وطن ہی ہوا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ خود حضرات انبیاء کرام کی بعثت بھی انہی کی قوموں کی طرف ہوتی تھی ...... والیٰ عاد اخاھم ھودا۔ والیٰ ثمود اخاھم صالحا ۱ وغیرہ عاد کی طرف اُنکے بھائی ہود اور ثمود کیطرف اُنکے بھائی صالح۔ دوسری دُنیا میں آجایئے تو یونانی۔ رومی۔ مصری۔ ایرانی۔ تورانی۔ ساسانی وغیرہ سب اقوام میں وجۂ جامعیت نسل اور وطن ہی تھا۔ مذہب نہ تھا۔ آریہ ورت میں تو قوم چھوڑکر ورنوں کی تقسیم بھی نسل سے ہوتی چلی آئی ہے۔ مذہب وجۂ جامعیت کہاں ملتا ہے اِس کا جواب تو ایک ہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہی دنیا میں وہ قوم تھی جس میں وجۂ جامعیت مذہب تھا۔ سواگر جواب یہ ہی ہے تو پھر حضرت مولانا اور کون سی نصِّ قطعی کی تلاش میں ہیں؟ اُن کے دعوے کا بطلان تو خود اسی ایک حقیقت کے اندر موجود ہے لیکن وہ تو یہ فرماتے ہیں "موجودہ زمانہ میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں۔ نسل و مذہب سے نہیں" یعنی انہیں بھی تسلیم ہے کہ اسلام جب دُنیا میں آیا ہے تو اسوقت (آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر) دنیا میں ایسا بھی ہوا ہے کہ قومیت مذہب کی بنا پر بنی۔ لیکن ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

آج وہ زمانہ نہیں اِس دَور میں تو قومیت وطن سے ہی بنتی ہے۔ اللہ اکبر! مولانا نے اتنا بھی غور نہ فرمایا کہ ع

میرے نشتر کی زد شریان قیس ناتوان تک ہے

---

۱ ملاحظہ ہو ۱۱/۵۰ - ۱۱/۶۱ - ۷/۶۵ (اوپر سورت اور نیچے آیت کا شمار ہے)

بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔ اُنکے نزدیک گویا اِسلام نے ایک وقتی نظریہ پیش کیا تھا۔ وہ نظریہ کوائف وحوائج کے بدلنے سے ناقابلِ عمل ہوگیا۔ (out of date) اور آج اسکی جگہ ایک اور نظریہ آگیا۔ اِس لیئے "قدامت پرست" مسلمانوں کو زمانہ کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ "پرانی باتوں" پر جمے رہنے سے یہ تباہ ہوجائینگے۔ یہ ہے مفہوم اِس جدید نظریہ کا!!

اب آیئے قرآنی وجۂ جامعیت کیطرف۔ فرمایا۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا۔	سب کے سب ملکر اللہ کی رسّی کو مضبوط تھام لو۔

یہ سب کو ایک مرکز پر جمع کرنے والی کون سی چیز ہے؟ حبل اللہ۔ تو اب اِس آیت کی رو سے وُجۂ جامعیت حبل اللہ ہوئی۔ اسکی تفسیر دوسری آیت میں یوں فرمادی:۔

ومن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقٰی لا انفصام لہا	اور جنے ہر سرکش قوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان رکھا اسنے ایک ایسے مضبوط رشتہ کو تھام لیا جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا

یعنی حبل اللہ جو وجۂ جامعیت تھی۔ وہی محکم رشتہ۔ دا العروۃ الوثقٰی ہے۔ اور یہ اللہ پر ایمان۔ اور اسکے سوائے ہر قوت کا انکار ہے یعنی دوسرے الفاظ میں۔ لاالٰہ (انکار) - الااللہ (اقرار)

یعنی دُنیا میں ایمان وکفر صرف دو چیزیں وجۂ جامعیت رہ گئیں پہلی مومنین کی جماعت کی وجۂ جامعیت دوسری غیر مومنین کی جماعت کی وجۂ جامعیت۔ اب دیکھئے کہ ان دونوں جماعتوں کے لیئے کہیں وطن کی حدود وقیود بھی آئی ہیں!

عرب ایک ملک تھا۔ وطنی نظریۂ قومیت کی رو سے وہاں کے سب باشندے ایک قوم ہونے چاہیئے تھے۔ لیکن اسی ایک ملک کے اندر دو مختلف قوموں کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، اور انکی الگ الگ وجۂ جامعیت بھی موجود ہے۔ سُورۂ توبہ میں ہے۔

الا تقاتلون قومًا نکثوا ایمانہم وہموا باخراج الرسول وہم بدءوکم اول مرۃ اتخشونہم فاللہ احق ان تخشوہ ان کنتم مومنین۔ قاتلوہم یعذبہم اللہ بایدیکم ویخزہم وینصرکم علیہم ویشف	کیا تم اس قوم سے نہ لڑوگے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور رسول کے جلاوطن کرنے کی تجویز کی، اور انہوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی۔ کیا تم اُن سے ڈرتے ہو؟ سو اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے تم اس سے ڈرو۔ اگر تم ایمان والے ہو تو۔ اُن سے لڑو،

صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ۹ / ۱۴-۱۵

اللہ ان کو تمہاری ہاتھوں سے سزا دیگا۔ اوران کو ذلیل وخوار کرے گا۔ اور تم کو ان پر غالب کرے گا اور ایمان والوں کی قوم کے سینے کو شفا دیگا۔

ایک قوم جو ایمان نہیں رکھتی۔ خدا ورسولؐ کی دشمن ہے اُس کے بالکل برعکس دوسری قوم جو ایمان رکھتی ہے اور خدا ورسولؐ کے احکام کے تابع ہے یہاں شارح ان دونوں اقوام میں الگ الگ وجۂ جامعیت وہی کفر اور ایمان ہے۔ وطن نہیں ہے۔ وطن کے اعتبار سے تو یہ سب کا فرو مومن ایک ہی قوم ہونے چاہیئے تھے۔ پھر اس قوم مومنین میں دیکھئے کہ جس کا ایمان اِس معیار پر پُورا نہیں اُترتا۔ جن کی اس امتیازی خصوصیت میں کمزوری واقعہ ہوجاتی ہے تو اس کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے فرمایا

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ۴۷ / ۳۸

ہاں تم لوگ ایسے ہو کہ تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیئے بلایا جاتا ہے تو بعض تم میں سے بخل کرتے ہیں اور جو شخص بخل کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔ اللہ تو غنی ہے تمہیں محتاج ہو اور اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا پھر وہ تمہارے جیسے نہ ہونگے۔

کیا اس سے یہ مطلب ہے کہ کسی عربی قوم کی جگہ ایرانی قوم آجائے گی۔ کیا یہ قوم کی تبدیلی اُنکے وطن کی تبدیلی سے ہوگی!! وہاں تو یہ بھی ساتھ ہی بتادیا ہے کہ وہ دوسری قوم کیسی ہوگی۔ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ۔ وہ تمہاری طرح نہ ہوگی۔ اس کی خصوصیتیں کچھ اور ہوں گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دوسری خصوصیتوں والی قوم بھی اس وطن سے پیدا کردی جائے۔ پھر یہ خصوصیت بھی وہی ہوگی جو قوم مومنین کی خصوصیت ہوتی ہے۔ فرمایا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ۵ / ۵۴

اے ایمان والو! جو شخص تم سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ بہت جلد ایسی دوسری قوم کو پیدا کردیگا جسے اللہ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ سے محبت ہوگی وہ مومنین کے سامنے جھک جانیوالے اور کافرین کے مقابلہ میں (فولاد کی طرح) سخت ہوں گے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہیں کھائینگے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمادے اور اللہ وسعت والا علیم

وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا ہے۔ تمہارے دوست تو اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ لوگ ہیں جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان
وَهُمْ رَاكِعُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ میں خشوع ہوتا ہے۔ سو جو شخص اللہ سے دوستی رکھے گا اور
رَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ اس کے رسول سے اور ایمان والوں سے۔ سو اللہ کا گروہ
هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ بے شک غالب رہے گا۔

یعنی جو تمہارے دین میں سے نکلتا جائے گا دوسری قوم بنتا جائے گا اور ایسے لوگوں کے خلاف اللہ ایسی قوم پیدا کردے گا جن میں ایمان والوں کی خصوصیات ہوں گی۔ دیکھ لیجئے وجہ جامعیت مذہب ہے۔ وطن، نسل وغیرہ کچھ نہیں۔ یہ نہیں کہا کہ جو تمہارے وطن سے نکل کر کسی دوسرے ملک میں جا بسے گا۔ اس کا شمار تمہاری قوم میں سے نہیں ہوگا۔ اور برعکس اس کے جو باہر سے آکر تمہارے ملک کا باشندہ ہو جائے گا۔ وہ تمہاری قوم میں سے ہو جائے گا۔ اسلامی قومیت کی وجہ جامعیت۔ اسلامی خصوصیات ہیں نہ کہ جغرافیائی حدود۔ جو ان خصوصیات سے باہر ہو جائے وہ اسی ملک میں رہتا ہوا بھی "غیر قوم" میں سے ہو جائے گا۔ دین سے ارتداد کے ساتھ یہ کہیں لازم نہیں آتا کہ وہ ملک بدر بھی ہو جائے۔ تمہارے دین کے اندر ہے تو تمہاری قوم میں سے ہے، دین سے باہر ہو گیا تو خواہ ہمسایہ ہی کیوں نہ ہو تمہاری قوم سے الگ ہو گیا۔ حزب اللہ میں سے نہ رہا، وہی حزب اللہ جس کی دوسری جگہ یوں تشریح فرما دی۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تو ان کو کبھی نہ
يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا دیکھے گا کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے
اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ رسول کے برخلاف ہیں خواہ وہ انکے باپ یا بیٹے یا بھائی یا
اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ کنبہ ہی کیوں نہ ہو۔ ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان
بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ ثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض سے قوت دی ہے وہ انکو
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ ایسے باغات میں داخل کرے گا جنکے نیچے نہریں جاری ہیں۔
عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اللہ ان سے راضی ہے یہ لوگ ہیں اللہ کا گروہ۔ حزب اللہ۔ اور
اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ یاد رکھو کہ اللہ ہی کا گروہ کامیاب ہوگا۔

ذرا غور فرمایئے اس آیت کے مختلف ٹکڑوں پر۔ یہ بیٹے اور باپ۔ بھائی اور اہل خاندان۔ ان میں تو وجہ جامعیت نہ صرف وطن ہے بلکہ نسل بھی ہے۔ یہ پھر دوسری قوم کیوں بن گئے! یہ باپ سے بیٹا الگ کس طرح ہو گیا! یہ بھائی سے بھائی کس لیئے جدا ہو گیا! یہ حزب اللہ کے مقابلہ میں حزب الشیطان کیسے بنگئے۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَاۗدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰۗىِٕكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ

ان پر شیطان نے پورا پورا تسلط کر لیا ہے اور ان کو خدا کی یاد بھلا دی۔ یہ لوگ حزب الشیطان ہیں اور یاد رکھو شیطان کا گروہ ناکام رہے گا۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ لوگ سخت ذلیل ہوں گے۔

اگر وطن ہی وجہ جامعیت ہو تو ظاہر ہے کہ ایک وطن میں حزب اللہ بھی ہو گا اور حزب الشیطان بھی اب، یہ دونوں ملکر کس طرح ایک متحدہ قوم بن سکیں گے۔ ایک کی خصوصیات کچھ۔ دوسرے کی کچھ۔ دونوں کے عناصر ترکیبی میں بعد المشرقین۔ ایک کے حصہ میں خدا کے وعدوں کے مطابق غلبہ او کامیابی۔ دوسرے کے مقدر میں اسی کے قوانین کے ماتحت ذلت و خواری۔ اگر یہ دونوں ملکر ایک قوم بن سکتے ہیں۔ اسی بنا پر کہ وہ ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ایک ہی قوم ایک ہی وقت میں غالب و کامیاب بھی ہو سکتی ہے اور ذلیل و ناکام بھی۔ اور اگر اس قوم میں دو گروہ ہوں گے ایک کامیاب اور دوسرا ناکام۔ تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک متحدہ قوم کبھی نہیں کہلا سکتے: قوم کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ابھرے تو ساری کی ساری اور ڈوبے تو ساری کی ساری۔ اسلیئے کہ اس کا ابھرنا اور ڈوبنا موقوف ہوتا ہے ان خصوصیات پر جو اس قوم کے مابہ الامتیاز نشانات ہوتے ہیں اور قرآن کریم کی رو سے یہ امتیازی شان جو ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ کرتی ہے ایمان اور کفر ہے۔ ایمان والوں کی قوم کے متعلق ہم نے دیکھ لیا کہ ان میں سے جو دین سے پھرتا گیا۔ دوسری قوم کا فرد شمار ہوتا گیا۔ باوجودیکہ اسی کا وطن وہی رہا جو پہلے تھا۔ اس کے برعکس کفار کی جماعت میں سے جو ایمان اختیار کرتا گیا۔ وہ اس قوم سے نکل کر اس نئی قوم کا جزو بنتا گیا۔ فرمایا کہ یہ کفار۔ اور یہ مشرکین۔ تم سے الگ جماعتیں ہیں۔ لیکن

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ۔ اگر یہ توبہ کر لیں (یعنے کفر و شرک سے باز آجائیں) اور نماز قائم کریں

فاخوانکم فی الدین ۹/۱۱

اور زکوٰۃ دیں تو یہی لوگ تمہارے دینی بھائی بن جائیں گے۔

یہ لوگ توبہ کرنے سے پیشتر بھی تو اسی ملک میں رہتے تھے۔ اُسوقت بھائی کیوں نہ بن سکے۔ اگر وطن ہی وجۂ جامعیت تھی تو اُسوقت اُن میں مواخات کیوں نہ پیدا ہوگئی۔ اس کے برعکس یہ توبہ کرکے یدخلون فی دین اللہ افواجاً۔ اللہ کے دین میں داخل ہونے والے کہیں کے باشندے ہوں تمام مومنین کے بھائی بنجائیں گے۔ سب ایک ہوجائینگے۔ وطن۔ نسل۔ رنگ۔ زبان۔ پیشہ کا اختلاف اُن کی اخوت۔ انکے ایک برادری بننے، کے راستے میں حائل نہ ہوسکیں گے۔ کہ جہاں قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ انما المومنون اخوۃ (تمام ایمان والے بھائی بھائی ہیں) وہاں کسی وطن کی قید نہیں لگائی ہے کہ یہ رشتہ تو ایسا ہے کہ بُعدِ مکانی کی طرح بُعدِ زمانی بھی اُسکے راستے میں حائل نہیں ہوسکتا آج کا مسلمان آج سے ہزار برس پیشتر گزرے ہوئے مسلمان کا بھی بھائی ہے کہ یہ قوم۔ یہ اُمت۔ خدائے حی وقیوم کے ایک زندہ پیغام کے واسطے سے باہمدگر پیوست ہے اور زمان ومکان کا بُعد اُنکے اس تعلق میں مخل نہیں ہوسکتا۔ یہ شروع سے ایک ہی قوم چلی آرہی ہے اور اخیر تک ایک ہی قوم رہے گی۔ جس طرح آج کے مسلمانوں کو اخوۃ (بھائی بھائی) کہا گیا ہے۔ اسی طرح اُنکے پیشرو مسلمانوں کو بھی اُنکا بھائی کہا گیا ہے۔

والذین جاؤا من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ۵۹/۱۰

اور جو لوگ انکے بعد آئیں گے وہ کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے بھائیوں کو بھی جو ہم سے پیشتر ایمان کے ساتھ رخصت ہوگئے ہیں (جنہوں نے ہم سے ایمان میں سبقت کی)۔

اس دعا میں قیامت تک کے آنیوالے مسلمان شامل ہیں اور تمام آنیوالے مسلمان اپنے پیشرو ایماندار لوگوں کے بھائی قرار دیئے گئے ہیں۔ بلکہ قرآن کریم تو مستقبل اور ماضی۔ آنے والے زمانے اور گزرے ہوئے زمانہ۔ دونوں میں ایک ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ ماضی میں اُمتِ مسلمہ بظاہر بعثت نبی اکرمؐ کے بعد سے وجود میں آئی ہے لیکن درحقیقت اس کا سلسلہ نوعِ انسانی کی ابتدا سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ مختلف حضرات انبیا کرام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:-

ان ھذہٖ اُمتکم اُمۃً واحدۃً وانا ربکم فاعبدون ۲۱/۹۲

یقیناً یہ تمہاری (سب انبیا کرام کی) جماعت ایک اُمتِ واحدہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں لیس میری ہی عبادت اختیار کرو۔

یعنی یہ تمام حضرات علیہم السلام جو دینِ فطرت کے حامل تھے، شروع سے اخیر تک ایک اُمتِ واحدہ کے افراد تھے۔ اِسی اُمّتِ واحدہ کی آخری کڑی (یہ سلسلۂ انبیاء) نبی اکرمؐ پر آکر ختم ہوئی۔ نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لیکن وہی اُمّت یعنی دینِ فطرت کی حامل جماعت مومنین کی شکل میں دُنیا میں قائم رکھی گئی۔ جو آخر تک قائم رہے گی۔ اِس اعتبار سے مومنین کی قوم۔ یہ اُمّتِ مسلمہ ایک مسلسل اور غیر منقطع قوم ہے جو دُنیا میں برابر چلی آرہی ہے اور یوں ہی چلی جائے گی۔ نہ مکان (Space) کا بُعد اُس میں خلا واقع ہونے دے گا نہ زمان (Time) کا کٹنے۔ کہ اس زندگی کے بعد، دوسرے دَور میں بھی یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔ وہاں بھی "قوموں" کی تقسیم انہی خصوصیات کی بنا پر ہوگی جو خصوصیات اس دُنیا میں ضابطہ خداوندی کی رو سے اقوام کی تقسیم کرتی ہیں یعنی وہی کفر و ایمان کا امتیاز۔ انسانوں کے وضع کردہ امتیازات نہ یہاں قابلِ قبول ہیں نہ وہاں درخورِ اعتناء ہونگے۔ فرمایا۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰى
اِلٰى كِتٰبِهَا۔ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ
ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ
كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝

تو اس روز ہر قوم کو دیکھے گا کہ زانوں کے بل گری (ہوئی) ہوگی ہر اُمّت اپنے نامۂ اعمال کی طرف بلائی جائے گی۔ آج تم کو تمہارے کیے کا بدلے گا۔ پس جو لوگ ایمان و عمل صالح والے ہوں گے تو ان کا رب انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا اور یہ کھلی ہوئی کامیابی ہے اور جو لوگ کافر ہوں گے تو اُن سے کہا جائے گا کیا میری آیات تم کو پڑھ پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں سو تم نے ان سے تکبر کیا اور تم (اس وجہ) قوم مجرمین بن گئے۔

اُس وقت جو ہر قوم اپنے اپنے نامۂ اعمال کے مطابق حاضر ہوگی تو اس سے مطلب یہ نہیں کہ اب ہندی آجائیں گے۔ اب ایرانی۔ پھر عربوں کو بلایا جائے گا۔ پھر مصریوں کی باری آئے بلکہ اُن کی تقسیم اعمال کے لحاظ سے ہوگی۔ پھر ۲ دو قومیں الگ الگ کر دی جائیں گی۔ قومِ مومنین الگ۔ قومِ کافرین الگ۔ خواہ اُنکے اوطان ایک ہی کیوں نہ ہوں۔ انہی میں سے ایک گروہ کو قومِ مجرمین کہا گیا ہے یعنی جن میں وجہ جامعیت جرم ہوگا۔ ایسے ہی جیسے دوسری جگہ فرمایا کہ هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (کیا فاسقوں کی قوم کے سوا اور بھی کوئی ہلاک ہوگا یعنی فاسقوں کی ہلاکت یقینی ہے)، سو اگر

قوم بننے کے لیے ایک وطن کا ہونا ہی ضروری ہے تو فرمایئے کہ یہ قوم الفاسقین کون سے جزیرہ میں رہتی ہے۔ اس قوم الفاسقین کا مطلب تو ظاہر ہے کہ دُنیا کے کسی حصّہ میں کسی مُلک میں جہاں کوئی فرد ایسا موجود ہو۔ جس میں فسق کی خصوصیت ہو۔ تو وہ اس وجہ جامعیت۔ اس قدرِ مشترک کی بدولت قوم فاسقین میں شامل ہوجائے گا۔ اسی طرح ہندی عربی۔ ترکی چینی سب مُلک کے فاسقین کی ایک قوم بن جائے گی۔ اسی طرح قرآن کریم میں قوم الظالمین۔ قوم الکافرین آیا ہے یعنی وہ افراد جن میں وجہ جامعیت ظلم۔ کفر وغیرہ ہوگا اور اسکے مقابل میں قوم الصالحین۔ تو ناموتنین کے معنی بھی واضح ہیں کہ دُنیا میں بسنے والے کہیں کے ۲۰ انسان جن میں ایمان و عمل صالح وجہ جامعیت ہو۔ وہ ایک قوم کے فرد ہونگے اسکے برعکس ایک ہی وطن کا کافر اور مومن دو الگ الگ فرد ہونگے۔ جیسے بوجہل و عمر ابن خطاب رضؓ اور دو مختلف و متباین ممالک کے اہل ایمان ایک قوم کے فرد ہونگے۔ جیسے صہیب رومی رضؓ اور سلمان پارسی رضؓ اور جیساکہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں' یہ قوم چونکہ سلسلہ انبیاء کرام کی وجہ سے شروع سے ایک قوم بنتی چلی آئی ہے اور اس دنیا کے اخیر تک بلکہ قیامت کے بعد اہل جنت کی تقسیم کے اعتبار سے بھی ایک ہی قوم رہے گی۔ اس لیے حضرت علامہ اقبال مدظلہٗ کے الفاظ میں یہ کہنا کس درجہ حقیقت پر مبنی ہے کہ اس قوم کا فرد اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقام محمدیؐ۔ یہ ہے منصب ملتِ اسلامیہ کا۔" وہی ملّتِ اسلامیہ جسکے متعلق فرمایا:۔

کنتم خیر اُمّۃ اخرجت للناس۔	تم بہترین قوم ہو جو نوع انسانی کے فائدہ کیخاطر پیدا کی گئی ہے۔

اس کنتم میں خطاب تمام اہل ایمان سے ہے اور انہی کے مجموعہ کا نام بہترین قوم ہے مومن ہندی ہو یا ایرانی اس خیر اُمّت کا فرد ہے کہ اس کا شمار کنتم میں ہوجائے گا۔ اس کُم (تم) میں ہوجائیگا جسکے متعلق ارشاد ہے کہ:۔

وکذٰلک جعلنٰکم اُمّۃ وسطاً ۔۔۔	اس طرح ہم نے تم کو ایک بہترین قوم بنا دیا ۔۔۔

لہ قرآن کریم میں قوم اور اُمّت دونوں جماعت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو مفردات امام راغب اصفہانی فارسی زبان میں ملت کے معنی جماعت کے ہی ہیں۔ ملاحظہ ہو غیاث اللغات۔ انہی معنوں میں حضرت علامہ اقبال مدظلہٗ نے اس لفظ کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ کیونکہ وہ شعر فارسی میں کہے گئے ہیں۔

یہ تو تھی مختصراً قرآنی تعلیم۔ اب اسکی عملی تفسیر نبی اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ میں دیکھئے۔ کم از کم یہ حصّہ تو وہ ہے جس کے متعلق بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ حضرت مولانا کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوگا کہ آپ دیوبند میں شیخ الحدیث ہیں لیکن کیا کہا جائے۔ اگر آپ کا نظریہ دُرست تسلیم کر لیا جائے کہ وطن کے بدل جانے سے قومیت بھی بدل جاتی ہے تو مسلمانوں کا سب سے پہلا قافلہ جو ہجرت کر کے حبشہ چلا گیا تھا۔ وطن کی تبدیلی کی بنا پر انہیں وہاں کی قومیت میں شامل ہو جانا چاہیئے تھا۔ کیا حضرت مولانا کا خیال ہے کہ اسوقت حبشہ کے مسلمان ایک الگ قوم تھے اور مکّہ کے مسلمان ایک الگ قوم! یہ تو زمانہ جاہلیت کا خیال تھا۔ کیا آپ کو یہ واقعہ یاد نہیں کہ غزوہ بنی المصطلق میں ایک غفاری اور ایک عوفی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ غفاری نے عوفی کو تھپیڑ مارا۔ بنی عوف انصار (اہل مدینہ) کے حلیف تھے۔ اور بنی غفار۔ مہاجرین (مکہ سے گئے ہوئے مسلمانوں) کے حلیف۔ عوفی نے انصار کو مدد کے لیئے آواز دی۔ اور غفاری نے مہاجرین کو یعنی وہی وطنیت کا ملّی۔ مدّنی جذبہ اُبھر آیا۔ اور غصّے میں یہ چیز بھول گئے کہ اب کی اور مدنی۔ مہاجر اور انصار ملکر ایک قوم بن چکے ہیں۔ جب حضورؐ کو اس کی خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیا جاہلیت کی پکار تھی جو تمہاری زبانوں سے نکل گئی؟ اس کے برعکس عبداللہ بن اُبی جو مدینہ کا وطن پرست تھا۔ اُس نے جاہلیت کے اس جذبہ کو مشتعل کرنا چاہا اور انصار سے کہا کہ یہ مہاجرین "ہمارے ملک" میں آکر بعض بھول گئے ہیں اور اب ہمارے ہی سامنے سر اُٹھاتے ہیں (اس کے بعد اور بھی خرافات اُسکے مُنہ سے نکل گئی تھیں جن کا دُہرانا مناسب نہیں) حضورؐ کو جب اس کا علم ہوا تو اُسکے بیٹے حضرت عبداللہ کو بلا کر کہا کہ تمہارا باپ یہ کیا کر رہا ہے! ان کی اپنے باپ سے محبت ضرب المثل تھی۔ لیکن یہ وطنیت کے جذبات کی پرورش اور اس کی بنا پر اُمّتِ مسلمہ۔ مومنین کی جماعت میں تفرقہ اندازی کی کوشش اتنا سنگین جُرم تھا کہ مدینہ میں آکر یہی وفا شعار بیٹا تلوار سونت کر باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا کہ تو مدینہ میں نہیں گھس سکتا۔ بالآخر جب خود نبی اکرمؐ نے اُسے معاف کیا تو انہوں نے باپ کو گھر میں جانے دیا۔

کیا اس کے بعد بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ وطنیت کی بنا پر قوموں کی تشکیل کس عہد کی یادگار ہے!! اور خدا اور اسکے رسولؐ کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے!! اگر وطن ہی وجہ جامعیت ہوتا تو مدینہ میں آنے کے بعد مسلمان وہاں کے یہودیوں سے الگ معاہدہ کیوں کرتے اور پھر اس معاہدہ

کی خلاف ورزی پر اُنہیں وہاں سے نکال کیوں دیتے! معاہدہ تو ہمیشہ دو مختلف اقوام میں ہوا کرتا ہے۔ اس معاہدہ کا وجود ہی اس بات پر دال ہے کہ مسلمان ایک وطن۔ بلکہ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی غیر مسلموں کے ساتھ ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مکّہ کے مسلمان اور مدینہ کے مسلمان دونوں ملکر ایک قوم بن جائینگے۔ لیکن مدینہ کے مسلمان اور مدینہ کے یہود ایک قوم نہیں بن سکتے۔ دو جداگانہ قومیں رہیں گے، کہ مسلمانوں میں وجہِ جامعیت؛ ایک قوم بننے کی قدرِ مشترک۔ اسلام ہے۔ وطن نہیں ہے

مدینہ میں کفار میں سے ایک شخص قزمان نامی تھا جسکے متعلق حضور فرمایا کرتے تھے کہ یہ جہنمی ہے۔ غزوۂ اُحد میں صحابہؓ نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کفارِ مکہ کے مقابلہ میں بڑی جانفشانی سے لڑ رہا ہے۔ حتےٰ کہ وہ لڑتے لڑتے گر پڑا۔ صحابہؓ کو بڑی حیرت تھی کہ یہ اس قدر اسلام کا جاں نثار نکلا اور حضورؐ نے اس کو جہنمی بتایا ہے، وہ اسکے قریب پہنچے، دیکھا تو مرنے کے قریب تھا اُنھوں نے کہا کہ مُبارک ہو کہ تو خدا اور رسولؐ کے راستہ میں لڑتا ہوا جان دے رہا ہے؛ اُس نے کہا کہ میں کسی کے راستے میں نہیں لڑا۔ مجھے تو یہ قومی عصبیت اُبھار کر میدان جنگ میں لے آئی کہ مدینہ والوں کی مکہ والوں سے لڑائی ہے۔ کہیں مکہ والے فتح نہ پا جائیں۔ اب صحابہؓ کو معلوم ہو گیا کہ مخبر صادق نے جو کچھ فرمایا تھا، وہ کس بنا پر تھا۔ یہ تھے زمانہ جاہلیت کے وہ نظریئے جنکو مٹانے کے لیے حضورؐ تشریف لائے اور ۲۳ سال کے مسلسل جہاد سے حضورؐ نے اُنہیں مٹا کر چھوڑا۔ چنانچہ فتح مکّہ کے بعد آپ نے اپنے خطبہ میں پُورے زور کے ساتھ اعلان کر دیا کہ لا فخر للانساب۔ لا فخر للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی۔ نسب میں کوئی فخر نہیں۔ یہ فرما کر تو نسلی امتیازات کا جذبہ مٹایا اور عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر کوئی تفوق نہیں۔ اس ارشاد سے وطنی امتیازات کی حدود و قیود توڑ دیں۔ یہی کچھ آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں بھی ارشاد فرمایا۔ کہ جسکے بعد دین کے کامل ہونے کی تصدیق قرآن کریم میں آگئی۔ یہی اخوت بشری اور عالمگیر برادری کی وہ تعلیم ہے جسے ان الفاظ میں دُہرایا

مثل المومنین فی توادھم وتراحمھم و تعاطفھم کمثل الجسد الواحد اذا شتکیٰ منہ عضو تداعیٰ لہٗ سائر الجسد بالسھر والحمیٰ۔	باہمی محبت۔ رحمت اور مہربانی میں مسلمانوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جسم کہ اگر اس کے ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم اُس کے لیے بے خواب و آرام ہو جاتا ہے۔

اگر وطن ہی وجہِ جامعیت ہو تو ایک ہندی مسلمان کو اس سے کیا غرض کہ ایک افریقی مسلمان پر کیا بیت رہی ہے ان دونوں کے درمیان تو وجہِ جامعیت مذہب ہی ہے۔ جس نے انہیں ایک جسم کے دو اعضا بنا دیا ہے کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا لگ جائے تو آنکھ کے آبگینہ میں آنسو چھلک آئے۔ لیکن اگر مذہب کا وجہِ جامعیت ہونا۔ بقول حضرت مولانا۔ پرانے زمانہ کی یادگار ہے۔ دَورِ حاضرہ میں یہ وجہ وطن سے بدل چکی ہے۔ تو یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن کریم کی یہ تمام آیات، حضورؐ کے یہ تمام ارشاداتِ گرامی۔ یہ سب اُسوہ حسنہ۔ ایک وقتی چیز تھا۔ جو حضورؐ کے زمانہ تک ہی محدود تھا۔ اس کے بعد کم از کم موجودہ زمانہ میں یہ سب نظریئے بدل گئے۔ اور اُن کی جگہ نئے نظریوں نے لے لی۔ آج ہندی مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور افغانی مسلمان ایک الگ قوم۔ اسلئے کہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسا پہاڑ حائل ہے جو اُن کی وجہِ جامعیت۔ یعنی ایمان۔ کو آر پار نہیں ہونے دیتا۔ حیرت ہے کہ حضرت مولانا نے اس پر بھی نہیں غور فرمایا کہ اُنکے اس نئے نظریے سے کسی فرعی مسئلہ پر ہی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ تو وحدت فی الحیات کے اس مہتم بالشان اصول کی جڑ کاٹ رہا ہے جس کی بنا پر اسلام تمام ادیان عالم سے متمیز اور سربلند ہے۔ یہ دریاؤں اور پہاڑوں کے حدود و ثغور کہ جن کی بنا پر اوطان کی تمیز و تقسیم ہوتی ہے سب ذہن انسانی کی پیداوار ہیں۔ اس لیئے کہ جس طرح نگاہ کی ایک حد ہے۔ سماعت کی ایک حد ہے، اسی طرح ذہن انسانی کی پرواز کی بھی ایک حد ہے جس چیز کا تعین تنہا عقل انسانی سے کیا جائے گا وہ یقیناً خاص حدود میں گھر کے رہ جائے گی۔ لیکن اسلام تو عقل انسانی کا پیدا کردہ نہیں یہ تو اُس ذات مطلق کا قانون ہے جو زمان و مکان کی حدود و قیود سے بلند و بالا تر ہے۔ جو رب المشرقین اور رب المغربین ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی لا شرقیۃ و لا غربیۃ۔ ہے۔ لیکن محسوسات کے خوگر انسان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اس بسیط حقیقت کو اپنے ذہن کے دائرے میں محصور کرلے۔ اور جب کبھی اُس نے ایسا کیا ہے۔ ایسے ایسے ہی تنگ دائرے وضع کرلیئے ہیں لیکن چونکہ یہ تنگ دائرے فطرتِ انسانی کے مطابق نہیں ہوتے اس لیئے انسانیت انکے اندر ہمیشہ مرغ رشتہ بر پا کی طرح بیتاب رہتی ہے بعض اوقات وہ کسی ایک قفس کی تیلیاں توڑ بھی ڈالتی ہے لیکن چونکہ پھر تنہا عقل سے ہی دوسرا دائرہ وضع کرتی ہے۔ اس لیئے پھر ایک

نے قفس میں گرفتار ہو جاتی ہے عقل کی تاریخ انہی مختلف دائروں اور زنجیروں کی بست وکشاد کا نام ہے۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر ... رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

یہی وہ طوق و سلاسل تھے کہ جنسے انسانیت کو آزاد کرنے کے لیے نبی اکرم صلعم مبعوث ہوئے حضورؐ کی بعثت کا مقصد یہ بیان فرمایا۔ کہ

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ۔ (اعراف)	اوران لوگوں پر جو بوجھ اور طوق ہوں گے اُن کو اُتار دے گا۔

نبی اکرمؐ نے دُنیا کو بتا دیا کہ کس طرح انسانیت ان طوق و سلاسل سے آزاد ہو کر اُس فضائے بسیط میں بال کشا ہو سکتی ہے کہ جہاں اس کی پرواز حدود ناآشنا اور قیود فراموش ہو جائے یہ تھی اسلام کی تعلیم لیکن آج یہ حالت ہے کہ خود وہ حضرات جو اس تعلیم کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں۔ آزادی کی اِن ہواؤں میں اُڑنے والے شہباز کو پکڑ کر پھر سے اپنی تنگ و تاریک پنجروں میں ٹھونس رہے ہیں جہاں اُس کا جگر خون ہو کے رہ جائے اگر ایسا کرنیوالوں کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ ؏

چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

تو اس میں کیا مبالغہ ہے کہ مقامِ محمد عربیؐ تو وہ ہے جو اوپر کی آیت میں جلوہ گر ہے۔ نہ وہ جو وطن کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ جائے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی تفسیر آیت مذکورہ صدر سے اگلی آیت میں ان الفاظ میں فرما دی گئی

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ	کہہ دو کہ اے نوع انسانی میں تم سب کی طرف۔ اس خدا کیطرف سے رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام ارض و سما میں ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی زندگی دیتا ہے وہی موت۔ سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اُسکے رسول اُمی پر جو خود اسپر ایمان رکھتا ہے اور اسکی باتوں پر (قرآن کریم) اور اسی کی اتباع کرو۔ تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ

لہٰذا ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ... اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

بصائر

دیدہ ور

اس عنوان کے ماتحت اسلامی تاریخ میں سے ایسے امثال و نظائر پیش کئے جایا کرینگے جن سے یہ حقیقت سامنے آجائے کہ جب کوئی انسان، یا کوئی جماعت، اپنی زندگی اس نظام کے ماتحت بسر کرے جو "خدا کی بادشاہت" کا نظام ہے، تو خود اس انسان، اس جماعت کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے اور اس تمام فضا کا کیا رنگ ہو جاتا ہے جس پر ان کے اعمال حیات اثر انداز ہوں۔ جب تک مسلمانوں کے سامنے صحیح اسلامی نظام کا تصور نہ ہوگا ان کے اعمال کبھی نتیجہ خیز نہ ہو سکیں گے۔ (طلوع اسلام)

حضرت عمرؓ کے عہد میں بیت المقدس فتح ہوا تو غیر مسلم مفتوح و مغلوب قوم کے ساتھ ایک فاتح و غالب قوم نے جو معاہدہ کیا وہ قابل غور ہے۔ یہ معاہدہ حضرت عمرؓ کی موجودگی میں اور انہی کے الفاظ میں لکھا گیا تھا۔

"یہ امان وہ ہے جو خدا کے غلام، امیر المومنین، عمرؓ نے ایلیا کے لوگوں کو دی۔ یہ امان انکی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار، اور ان کے تمام مذہب والوں کیلئے ہے اس طرح پر کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت اختیار کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے۔ نہ ان کو، نہ ان کے احاطہ کو کسی قسم کا نقصان پہنچایا جائے گا۔ مذہب کے معاملہ میں ان پر کوئی جبر نہیں کیا جائے گا۔ نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہیں رہنے پائیں گے۔ ایلیا والوں پر فرض ہے کہ اور شہروں کی طرح جزیہ دیں۔ اور یونانیوں کو نکال دیں۔ یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا اس کی جان اور مال کو امن ہے۔ تا آنکہ وہ اپنی جائے پناہ میں پہنچ جائے۔ اور اگر وہ ایلیا میں ہی رہنا چاہے تو اس کو بھی امن ہے بشرطیکہ وہ جزیہ دینا قبول کرے۔ اور ایلیا والوں میں سے جو شخص اپنا جان و مال لیکر یونانیوں کے ساتھ جانا چاہے تو ان کو اور ان کے گرجاؤں اور صلیبوں کو امن ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جائے پناہ تک پہنچ جائیں۔ اور جو کچھ اس تحریر میں ہے اس پر خدا کا عہد ہے۔ اور اس کے رسولؐ اور خلفاء اور مومنین کی جماعت کا ذمہ ہے۔ بشرطیکہ یہ لوگ مقررہ جزیہ ادا کرتے رہیں۔ اس تحریر پر گواہ ہیں خالد بن ولید عمرو بن العاص، معاویہ ابن ابی سفیان اور عبد الرحمٰن بن عوف۔ اور ۱۵ھ میں لکھا گیا" (الفاروق)

دو ایک باتیں تشریح طلب ہیں۔ عیسائیوں کے خیال میں چونکہ حضرت عیسیٰ کو یہودیوں نے صلیب دیا تھا اور یہ واقعہ بیت المقدس میں ہی ہوا تھا لہذا ان کی خاطر سے یہ شرط منظور رکھی کہ ایلیا میں اگر یہودی آباد نہ ہوں تاکہ عیسائیوں کے مذہبی احساسات کو ٹھیس نہ لگے۔ یونانی باوجودیکہ مسلمانوں کے ساتھ لڑے تھے۔ ان کو بھی

ہر قسم کی امان دی گئی۔ اگر وہ جزیہ دینا قبول کریں تو مسلمانوں کی امان میں رہیں۔ اور اگر چلے جانا چاہیں تو امن امان میں دوسری جگہ چلے جائیں۔ حتیٰ کہ اگر بیت المقدس کے عیسائی چاہیں کہ مسلمانوں کے دشمنوں رومیوں سے مل جائیں۔ تو بھی ان سے تعرض نہ کیا جائے اور ان کی عدم موجودگی میں ان کے گرجوں کی حفاظت کی جائے۔ جزیہ کے معنی یہ تھے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کی امان و حفاظت میں رہنا چاہے۔ وہ چونکہ فوجی خدمت سے مستثنےٰ قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے اپنی حفاظت کے معاوضہ میں ایک خفیف سا ٹیکس ادا کر دیا کرے۔ یہ ٹیکس کمزوروں۔ بچوں۔ عورتوں۔ بوڑھوں۔ معابد کے پجاریوں سے وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ نہ ہی ان سے جو اپنے آپ کو فوجی خدمات کے لئے پیش کر دیں۔ برعکس اس کے خود مسلمانوں کو فوجی خدمات بھی سرانجام دینی ہوتی تھیں اور اس کے ساتھ زکوٰۃ بھی۔ جو جزیہ سے کہیں زیادہ ہو جاتی تھی۔

ان معاہدوں کی توقیر کس طرح سے ہوتی تھی اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگا لیجئے کہ جب حمص فتح کیا گیا تو وہاں کی غیر مسلم رعایا سے انکی حفاظت کے لئے سال بھر کا جزیہ لیا گیا۔ اتفاق سے چھ ہی مہینے کے بعد مسلمانوں کی فوج کو کسی دوسری جگہ ضرورۃً منتقل ہونا پڑا۔ بارگاہِ خلافت سے حکم آ گیا کہ چونکہ باقی چھ ماہ کے لئے ہم انکی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہونگے۔ اس لئے نصف زرِ جزیہ ان کو واپس دیدیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی فوج کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھی اور حمص کے عیسائی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ان کو الوداع کہتے تھے اور التجائیں کرتے تھے کہ جلدی واپس آ جانا کہیں ہم پر پھر وہی عیسائی حکومت دوبارہ تسلط نہ جمالے۔

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن همہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

اس دور کو بھی چشمِ فلک نے دیکھا۔ اور اس سے پیشتر اس دورِ تہذیب کو بھی جس میں مشہور مقنن سولن کا یہ نظریہ دنیا کے سیاست میں ضرب المثل تھا کہ "معاہدہ مکڑی کا جالا ہے۔ جو اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے۔ لیکن اپنے سے طاقتور کے سامنے ایک سیکنڈ کے لئے نہیں ٹھیر سکتا" اور اس کے بعد اس نے دورِ حاضرہ کی اس تہذیب کو بھی دیکھا جس میں میکیاولی کے سیاسی نظریات نصب العین حیات بن رہے ہیں۔ جو سب اس انداز کے ہیں کہ

"حکمران جسقدر طاقتور، مکار اور فریبی ہوگا اسی قدر اسکا اقتدار قایم ہوگا۔ میدان جنگ میں تقویٰ۔ طہارت خدا ترسی۔ اور نکوکاری مطلق کار آمد نہیں ہو سکتی۔ مکاری کے سامنے خدا ترسی اور نکوکاری سب دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ خدا ان کی مدد کرتا ہے جن کے پاس بڑی بڑی توپیں ہوں۔ نہ ان کی جو حق پر ہوں۔"

لیکن اس کا انجام —— یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد۔

کانگریس لیگ اور مسلمان

(ڈاکٹر تصدق حسین خالد۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ بار ایٹ لا)

پچھلے دنوں رسالہ جامعہ میں عنوان بالا کے ماتحت مضامین کا ایک سلسلہ شائع ہوا ہے۔ جس میں موجودہ سیاسی کشمکش کے ہر دو زوایۂ نگاہ یعنی مسلمانوں کے کانگریس میں شریک ہونے کے موافق اور مخالف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ مضمون اسی سلسلہ میں رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لیئے بھیجا گیا تھا لیکن چونکہ انہوں نے اب اس سلسلہ کو ختم کر دیا ہے وہاں شائع نہیں ہو سکا۔ ہر چند اس کا اصلی محل وہی رسالہ تھا مگر چونکہ موضوع ایسا ہے جس سے آج تمام ہندوستان کے مسلمان متعلق ہیں اس لیئے اس کی اشاعت طلوع اسلام میں ضروری سمجھی گئی ہے۔

مذکورۂ صدر سلسلۂ مضامین میں جتنی بحث ہوئی ہے وہ عام طور پر سیاسی دلائل تک ہی محدود رہی ہے۔ لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کو ہر مسئلہ کے لیئے اور بالخصوص ایسے مسئلہ کے لیئے جس سے قوم کی موت اور حیات کا رشتہ وابستہ ہو۔ قرآن کریم کی روشنی میں ہی کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہی اختلافی مسائل میں فریقین کے لیئے حکم ہو سکتا ہے، اور اسی کا فیصلہ قول فیصل کا حکم رکھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآنی نقطۂ نظر سے بھی اس مسئلہ پر کچھ بحث کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ موجودہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سوال تک پہنچیں متعین کرنا ضروری ہے کہ موجودہ کشمکش میں آزادی سے مفہوم کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہندوؤں نے موجودہ غلامی کے خلاف جو جد وجہد شروع کی ہے تو وہ اس جذبہ سے متاثر ہو کر کی ہے کہ ان کے ملک کی دولت ایک غیر قوم کے ہاں چلی جا رہی ہے۔ یہاں کی پچاس فیصدی آبادی کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ یہاں کی ستر فی صدی آبادی کو تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں میسر آتا۔ نوے فیصدی آبادی قرضے کے وبال میں جکڑی ہوئی ہے۔ لہذا وہ اس نظام کو الٹنا چاہتے ہیں جس کی رو سے ہندوستان کے رہنے والوں پر عرصۂ حیات

تنگ ہو رہا ہے اور اس کے بدلے ایک ایسا نظام قایم کرنا چاہتے ہیں جس کے ماتحت ان کے ملک کی پیداوار کی داد و ستدان کے اپنے ہاتھ میں ہو۔ اور جس سے ملک کی بربادی خوشحالی میں بدلجائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے نزدیک غلامی سے مفہوم معاشی اور اقتصادی غلامی کا اور آزادی سے مقصود معاشی اور اقتصادی آزادی اور بس یعنی ان کو اگر آج ملک کے معاشی نظام کا پورا پورا اختیار دیدیا جائے تو آج انکی سیاسی جنگ ختم ہوجائے کیونکہ انکے نقطۂ خیال کے مطابق اس طرح ان کو آزادی حاصل ہوجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پورنیہ سوراج پہلی کڑی بدیشی مال (بالخصوص کپڑے) کا مقاطعہ تھا تاکہ ملک کی دولت کا ایک بڑا حصہ جو یوں بدیش کھنچا چلا جارہا ہے اپنے ہی ملک میں رہے۔ لنکا شائر کے کارخانوں کی چہل پہل" برلا ملز" میں منتقل ہوجائے۔ ہندو کو اس معاملہ میں صرف باہر کے لوگوں کا ہی خطرہ ہے اس لیئے کہ جہاں تک اندرون ملک کا تعلق ہے ہندو حتی الامکان کسی غیر ہندو کے پاس اپنا پیسہ نہیں جانے دیتا یعنی انجیل کے الفاظ میں بھارت ماتا کے سپوت کبھی بیٹوں کی روٹی کتوں تک نہیں پہنچنے دیتے"۔

یہ ہے وہ غلامی کی لعنت جس کے خلاف آزادی کی جنگ جاری ہے اور اسی لیئے پنڈت جواہرلال نہرو برملا کہتے ہیں کہ انکے نزدیک صرف ایک ہی مسئلہ اہم ہے یعنی جھونپڑا اور روٹی لیکن کیا مسلمان کے نزدیک بھی غلامی اتنی ہی بات کا نام ہے اور اس لیئے اس کے نزدیک آزادی بھی کچھ ہوسکتی ہے یا اس سے کچھ زیادہ بھی۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمان کے نزدیک معاش اور اقتصادیات کی غلامی سے کہیں زیادہ اندوہ ناک اور جگر سوز غلامی اس کی مذہبی غلامی ہے۔ یہ موجودہ نظام حکومت سے محض اس لیئے نالاں نہیں کہ اسکی رو سے اس پر معاش کے دروازے تنگ ہو رہے ہیں بلکہ اس لیئے کہ اس نظام کے ماتحت اسے مذہب کی آزادی حاصل نہیں لہٰذا اسکی آزادی کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کو مذہبی آزادی حاصل ہوجائے۔ یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مذہبی آزادی کا نام محض نماز روزہ کی ہی آزادی نہیں کیونکہ نماز۔ روزہ کی آزادی تو اسے آج بھی حاصل ہے۔ اس آزادی کے باوجود اگر یہ اپنے آپ کو مذہبی حیثیت سے غلام کہتا ہے تو اس لیئے کہ اسکا قرآن آزاد نہیں۔ اس کا اسلام آزاد نہیں۔ آج حالت یہ ہے کہ۔ اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد اور اسی "آزادی" کا نام ہے غلامی"۔

اب یہیں سے دونوں راستے الگ الگ ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندو جس وقت پورے اطمینان سے سانس لے کر پرماتما کی کرپا سے اسے پورنہ سوراج، مل گیا ہے۔ مسلمان اس وقت بھی ایک سرد آہ کھینچے کہ وہ تو ہنوز ویسے کا ویسا ہی غلام ہے۔ لہٰذا مسلمان کے نزدیک آزادی کا مفہوم اور ہے اور ہندو کے لئے اور۔ اور جب تک مسلمان کو یہ یقین نہ ہو جائے کہ جس آزادی کے لئے جدوجہد جاری ہے جس کے لئے اتنی قربانیوں کی طلب ہے۔ وہ وہی آزادی ہے جو اُس کے مفہوم میں آزادی کہلا سکتی ہے۔ اس کے لئے آزادی کی جنگ اپنے اندر وہ کشش نہیں رکھ سکتی جو ایک ہندو کے لئے رکھتی ہے۔ مسلمان کے لئے آزادی کا مفہوم ایک اور صرف ایک ہے،

ان الحکم الا للّٰہ	حکومت صرف اللہ کی حکومت ہے

اور غلامی اس کے نزدیک یہ ہے کہ

ومن لم یحکم بما انزل اللّٰہ فاولٰئک ھم الکافرون نیز۔ اولٰئک ھم الفاسقون اولٰئک ھم الظالمون (المائدہ)	اور جو اس کے مطابق حکم نہیں کرتا۔ فیصلے نہیں کرتا جو اللہ نے نازل کیا ہے تو یہ لوگ کافر ہیں۔ فاسق ہیں۔ ظالم ہیں۔

اس لئے کہ

ومن احسن من اللّٰہ حکما لقوم یوقنون	ایمان و ایقان والوں کے لئے خدا سے بہتر اور کون فیصلہ کرنیوالا۔ حکم ہو سکتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کانگریس۔ حصول آزادی کے بعد ملک میں جو نظام حکومت قایم کرنا چاہتی ہے۔ اس کی رو سے کیا مسلمان کو اس کی مطلوبہ آزادی مل سکتی ہے؟۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے۔ کانگریس کا سیاست ہند میں بنیادی مسلک یہ ہے کہ مذہب۔ اگر کوئی قابل ذکر شے ہے بھی تو۔ صرف خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق کا نام ہے۔ ایک مسلمان محراب کے سائے میں ہے۔ ایک ہندو مندر کے گھنٹے کے نیچے۔ آنکھیں بند کر کے دو دو چار منٹ سستا لے۔ اور اس میں کوئی مخل نہ ہو۔ باجہ تو خیر مخل ہو ہی نہیں سکتا۔ تو مذہبی شعبہ پورا ہو گیا۔ ان چار دیواریوں سے جب وہ باہر آئے تو پھر وہ ہندی ہو۔ مسلمان اور ہندو کچھ نہیں۔ ملک کا نظام حکومت ہندیوں کے لئے ہو گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے نہیں ہو گا۔ ہندو کو تو اس میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس لئے کہ جو کچھ بھی ہندی نظام ہو گا۔ وہ ہندو نظام ہو جائے گا۔ یا یوں کہئے کہ جو ہندو نظام ہو گا۔ وہی ہندی نظام ہو جائے گا۔ لیکن اگر مسلمان کا مذہب وہی ہے جو قرآن و سنت کے اند

اور وہ نہیں جو قوم پرست مسلمانوں کی تقاریر میں ہے تو ظاہر ہے کہ آج کی غلامی اور آنے والی آزادی میں کچھ فرق نہیں ہوگا۔ اور اگر یہ باجہ۔ گائے۔ جھٹکا کے مسائل یونہی جاری رہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ آزادی آج کی غلامی سے بھی زیادہ گلوگیر ہو جائے اس لئے کہ آج اگر مسلمان کا تمدن یا عمرانیت یورپ کی ملوکیت کے خلاف نہ جائے تو اس تمدن و تہذیب سے کوئی نہیں الجھتا۔ برعکس اس کے مسلمان اور ہندو کے تمدن کا آٹھوں پہر آپس میں ٹکراؤ ہوگا۔ لہذا اس تصادم کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ نظام حکومت تمدن اور عمرانی مسائل میں بھی دخل انداز ہو۔ مسلمان کانگریس سے صرف اتنا پوچھتا ہے۔ اور بار بار پوچھتا ہے کہ اس حیثیت سے اس کی آزادی کا کیا رنگ ہوگا۔ لیکن کانگریس اسے کبھی مطمئن کرانے کی کوشش نہیں کرتی (نہ شاید ضرورت سمجھتی ہے) کہ آئندہ آزادی میں وہ فی الحقیقت ایسا ہی آزاد ہوگا جیسا وہ آزاد ہونا چاہتا ہے۔ بلکہ قرائن اس کے برعکس جاتے ہیں اور یہ حقیقت تو چھپانے سے بھی نہیں چھپ سکتی کہ جو مسلمان آج "قوم پرست" ہو جاتا ہے وہ اسی اسلام کے سطح سے یقیناً پانچ سات درجے نیچے اتر آتا ہے جبکہ وہ اس دور قوم پرستی سے پیشتر تھا اس زمرہ میں صرف کسی نگار اور کسی کلیم کے ارباب ترتیب و تدوین ہی نہیں جو بالکل دہریے ہو چکے ہیں بلکہ بڑے بڑے جید مسلمانوں کی بھی یہی کیفیت ہو چلی ہے۔ مولنا ابوالکلام آزاد ۱۹۱۳ء میں آیت

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ۔۔۔ کا ترجمہ لکھتے تھے۔

> آج سے جو انسان احکام اسلامی کی جگہ دوسری تعلیم تلاش کریگا تو یقین کرو کہ اس کی تلاش کبھی مقبول نہ ہوگی۔۔۔۔ (الہلال بابت ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء)

اور وہی مولانا ۱۹۳۳ء میں اسی آیت کا ترجمہ یہ فرماتے ہیں۔

> اور جو کوئی اسلام کے سوا (جو عالمگیر سچائی اور تصدیق کی راہ ہے) کوئی دوسرا دین چاہے گا۔ تو یاد رکھو اس کی راہ کبھی قبول نہ کی جائیگی (ترجمان القرآن جلد اول ص ۱۵۰)

اور اس "عالمگیر سچائی" کی تفسیر یہ فرماتے ہیں۔

> "دین حق کی اس اصل عظیم کا اعلان کہ سعادت و نجات کی راہ یہ نہیں کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی یا اسی طرح کی کوئی دوسری بات اختیار کر لی جائے۔ بلکہ وہ سچی خدا پرستی اور نیک عمل کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے۔" (ترجمان ص ۲۲۹)

یعنی ۱۹۱۳ء میں اسلام کے معنی "احکام اسلامی" تھے۔ جو لامحالہ عبادت کی مخصوص شکل کھانے پینے کی چیزوں کی

خاص پابندیوں کا نام تھا لیکن وہی اسلام ۱۹۳۲ء میں ان تمام پابندیوں سے آزادی کا نام ہوگیا اور دین نام رہ گیا۔ خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی کا۔ یعنی وہی چیز کہ "مذہب خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق کا نام ہے" احکام میں کسی خاص اسلامی قانون کی ضرورت نہیں۔ یہ قانون مُلکی بھی ہوجائے تو بھی کوئی بات نہیں۔ مسلمان مسلمان ہی رہیگا۔ وہی مولٰنا آزاد جو ۱۹۲۰ء میں لکھتے تھے کہ۔

"بس جاہلیت کا دوسرا نام تفرقہ ہوا اور اسلام کا دوسرا نام جماعت۔ اور التزام جماعت۔ یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے اور اعلان کیا گیا ہے کہ جو شخص جماعت اور طاعتِ امام سے الگ ہوگیا گویا وہ اسلام سے خارج ہوگیا اور اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگئی اگرچہ نماز پڑھتا ہو روزہ رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو" (مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب صفحہ ۱۶۳)

انہی مولٰنا آزاد کے سامنے پنڈت جواہرلال نہرو ببانگ دُہل کہتے ہیں کہ میں ہندوستان میں صرف دو جماعتوں کے وجود کو تسلیم کرتا ہوں۔ گورنمنٹ اور کانگریس۔ مسلمانوں کی الگ جماعت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اور وہی مولانا جو کبھی تحریر و تقریر کے بادشاہ تھے اپنے بے پناہ سکوت سے عملاً اس کا اعلان کرتے ہیں کہ پنڈت جی نے کتنی بڑی حقیقت ثانیہ کا انکشاف فرمایا ہے۔

سیٹھ یعقوب حسن صاحب جنہوں نے کشاف الہدیٰ۔ تفسیر قرآن کا غالباً مقدمہ اس غرض سے لکھا کہ قرآنی تعلیم کو دُنیا کے تمام ادیان کی تعلیم سے بہترین ثابت کیا جائے۔ کانگریس کی وزارت کے بعد مدراس کے جینیوں کے ایک جلسہ کی صدارتی تقریر فرماتے ہیں کہ کسی مذہب کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے مذہب پر اپنی برتری اور فوقیت کا اظہار کرے (بحوالہ ٹرتھ مورخہ ۱۹ اکتوبر ۳۷ء)

یہ بھی ظاہر ہے کہ آزادی کے نظام حکومت میں قوانین کی تدوین و ترویج اسی طریق جمہوریت سے ہوگی جو آج عام طور پر جاری و ساری ہے۔ اور جس میں مسائل کا فیصلہ آراء کے شمار پر منحصر ہوتا ہے یعنی آج اگر کسی مجلس میں یہ سوال پیش ہوجائے کہ خُدا کا وجود ہے یا نہیں۔ اور عدم وجود کے مدعی ایک رائے سے جیت جائیں۔ تو اقلیت کو ماننا پڑے گا کہ حقیقت وہی ہے جو اکثریت نے فیصلہ کیا ہے۔ اور خدا کے وجود کا اقرار جرم قرار دیا جائے گا۔ لیکن مسلمان جس اسلام کی آزادی چاہتا ہے

اس کے حقائق اپنی صداقت کے لئے کثرتِ آراء کے محتاج ہیں۔ وہ ازلی اور ابدی حقائق ہیں۔ کہ اگر دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہ رہے جو ان کے موافق رائے دے سکے۔ تو بھی وہ حقیقت۔ حقیقت رہے گی یعنی جیسے اگر دنیا میں کوئی بھی آنکھوں والا نہ رہے۔ تو بھی سورج ایسی ہی روشنی دے گا۔ جیسی آج۔ مثلاً قرآن کریم نے تقسیم وراثت کا ایک مکمل قانون مسلمانوں کو دیا ہے۔ اگر کسی مجلس واضع قوانین میں ۹۹ فیصدی آراء سے بھی کوئی قانون اس قانون کے خلاف منظور ہو جاتا ہے۔ اور نافذ العمل قرار دے دیا جاتا ہے۔ تو مسلمان اسے حق تسلیم کرنے پر کبھی تیار نہیں ہوگا۔ اور اگر اس سے ایسا قانون بجبر منوایا جائے گا تو یہی اس کی غلامی ہوگی۔

مسلمان کانگریس سے پوچھتا ہے۔ اور بار بار پوچھتا ہے کہ ایسے معاملات میں آزادی ملنے کے بعد اس کی پوزیشن کیا ہوگی۔ لیکن کانگریس کبھی اس کو ضمانت نہیں دیتی کہ آزادی ملنے کے بعد اسکا قرآن بھی آزاد ہوگا سب سے قوی دلیل کانگریس کی شرکت کے جواز میں یہ دی جاتی ہے کہ اگر ہندوستان سے انگریز کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو اس کا اثر اسلامی سلطنتوں اور مسلمانوں کے اماکن مقدسہ پر پڑے گا۔ اور وہاں بھی انگریز کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی۔ لہذا ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے دوسرے اسلامی بھائیوں کی خاطر اس جنگ میں شریک ہونا چاہیئے۔

یہ دلیل بظاہر خوش آئندہ ہے اور مسلمانوں کے اس مقدس جذبہ کو اپیل کرتی ہے جس کی خاطر وہ بہت کچھ قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ اس دلیل کی سطحی نظر فریبی سے ذرا گہرے اتر یئے اور دیکھئے کہ اس میں حقیقت کتنی ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان یہ کہدے کہ ع

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" تو قوم پرست طبقہ اس کے پیچھے اس طرح پڑ جاتا ہے گویا وہ "اشدھ" ہو گیا۔ اور اگر وہ کہیں اس جذبہ کو ظاہر کر دے کہ "آرزو دارم کہ میرم در حجاز" تو پھر تو وہ گویا گنگا جانے پر بھی پوتر نہیں ہو سکتا۔ مسلمان کے خلاف سب سے بڑا جرم یہی عائد کیا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اپنے دلی رشتوں کو۔ افغانستان۔ ایران ترکی حجاز سے وابستہ کئے رہتا ہے اور اس کی اس اخوت اسلامی کو دورِ جہالت کی یادگار اور سنگین قسم کی "فرقہ پرستی" قرار دیا جاتا ہے۔ اور وہ بھارت ماتا کے مندر میں داخل ہونے کے قابل نہیں سمجھا جاتا جب تک وہ اپنی جبین نیاز سے اس داغ سجود کو نہ مٹا ڈالے۔

اب ظاہر ہے کہ جب دیگر اسلامی ممالک سے کوئی قلبی واسطہ رکھنا شریعت قومیت پرستی میں

اس درجہ گناہ عظیم ہے تو پھر ایک ہندی مسلمان کو اس سے کیا کہ ان ممالک پر انگریز کی گرفت سخت ہے یا ڈھیلی۔ اس صورت میں اس مسلمان کے لئے۔ ایران اور جاپان میں کیا فرق رہ جائیگا اس کی بلا سے کہ کس کی گرفت کس پر ہے۔ دور حاضرہ کے مسلمان تو پھر بھی حجاز اور ترکی سے کچھ نہ کچھ تعلق محسوس کرتے ہیں لیکن ذرا تصور میں لائیے اس وقت کو جبکہ ایک قوم پیدائشی "قومیت پرست" ہو۔ یعنی موجودہ مسلمانوں کی آئندہ نسل۔ اور ممالک اسلامی سے رابطہ اتحاد انکے نزدیک ٹھہرے جذبہ وطنیت کے خلاف اور انتہائی تنگ نظری تو رفتہ رفتہ اس بات کا تو احساس ہی مٹ جائیگا کہ مسلمان کہیں اور بھی بستے ہیں اور اگر یہ سچ ہے کہ آزادی حاصل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ انگریز کی گرفت ممالک اسلامی سے ڈھیلی پڑ جائے تو پھر اس کے معنی کچھ سمجھ میں نہیں آتے کہ مہاتما جی انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کو ایسا حادثہ عظیم (calamity) کیوں خیال کرتے ہیں کہ جسے ٹالنے کے لیے وہ پران تک دینے کو تیار ہیں (بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء) اس سے تو ظاہر ہے کہ ہندوؤں کے پیش نظر آزادی سے مفہوم محض درجۂ نو آبادیات ہے جس میں خارجی امور کے متعلق ہندوستان بدیشی سلطنت کی پالیسی کے ہی ماتحت رہیگا۔ اب یہ کون نہیں سمجھ سکتا کہ اس وقت انگریز کا اثر ممالک اسلامی پر سے کتنا کم ہو جائیگا۔ مسلمان کانگریس سے اتنا ہی تو پوچھتا ہے کہ اگر ایسا وقت آجائے کہ انگریز کے تعلقات کسی اسلامی مملکت سے کشیدہ ہو جائیں تو اس آویزش میں ہندوستان کی حکومت کی کیا روش ہوگی۔ لیکن کانگریس کبھی مسلمان کو اس باب میں مطمئن کرانے کی سعی نہیں کرتی اور کرے بھی کسطرح۔ کیا کانگریس یا آزاد ہندوستان کی حکومت پرائے شگون کی خاطر اپنی ناک کٹوا لے گی۔ امور خارجیہ میں انگریز سے بگاڑنا! ہندو اسکا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے اماکن مقدسہ سے ہمدردی بھی کیا ہو سکتی ہے! برعکس اس کے مسلمان ان ممالک اسلامی کے مسلمانوں سے قلبی تعلقات قایم کرنے پر مجبور ہے کہ جب اس کے قرآن نے کہا ہے کہ انما المؤمنون اخوۃ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ایسے بھائی گویا تمام ایک جسم واحد کے مختلف اعضا ہیں تو اس سے مقصود محض ہندوستان کی چار دیواری کے مسلمان ہی نہیں ہیں! ہندو اس وسعت کو صحیح معنوں میں سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اس کی کل کائنات اسی ہندوستان کے اندر محدود ہے۔ اس کی اہمیت پوچھئے انگریز سے کہ اگر مغربی افریقہ میں ایک گورے پر مصیبت آجائے تو لنڈن میں قیامت برپا ہو جاتی ہے۔

مسلمان اگر آج اپنی غلامی کو محسوس کرتا ہے تو اس لیئے کہ وہ اس اخوت اسلامی کے معاملہ میں آزاد نہیں اور اگر اسے آزادی کے بعد بھی اس مسئلہ میں ایسا ہی رہنا ہے تو اس کی غلامی اور آزادی میں چنداں فرق نہیں!

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ قطع نظر دیگر امور کے۔ خالص ہندی سیاست کے مسائل میں بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے مطامح نگاہ ایک دوسرے سے الگ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مختلف افراد کی ایک قوم بننے کے لیئے دنیا نے مختلف معیار قائم کیئے ہیں۔ نسلی اشتراک۔ لسانی اشتراک۔ جغرافیائی اشتراک۔ لونی (رنگ کا) اشتراک وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے مسلمانوں کی قومیت ان معیاروں سے ایک بالکل جدا اگانہ معیار پر قایم کی گئی ہے اور وہ بنیاد وحدت تخیل ہے جسے ایمان کہتے ہیں اور یہی عناصر تخیلی ہیں جو اسے دوسری اقوام عالم سے متمیز کرتے ہیں اور انھی عناصر کی آزادی کا نام مسلمان کے نزدیک آزادی ہے اور مسلمان چاہتے بھی یہی ہیں کہ پیشتر اسکے کہ وہ اس جنگ آزادی میں سربکف شریک ہو جائیں۔ وہ اس بات کا اطمینان کرلیں کہ آزادی مل جانے کے بعد ان کے ان عناصر تخیلی کا تحفظ ضرور ہوگا۔ یعنی انکا قرآن آزاد ہوگا۔ برعکس اس کے دوسری جماعت جسے قوم پرستوں کی جماعت کہا جاتا ہے۔ انکا یہ مسلک ہے کہ مسلمانوں کو حصول آزادی کے لیئے رجوان کے نظریہ کے مطابق ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ نصب العین ہے اور جو تصریحات بالا کے مطابق دراصل ایسا نہیں ہے) ہندوؤں پر کلیتہً اعتماد کر کے بلا کسی شرائط وقیود کے انکے ساتھ شامل ہو جانا چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اتحاد فی العمل کے لیئے جو شرائط وقیود کی سطح سے بلند ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا قلبی تعلق۔ دلی وبستگی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے اس قسم کے قلبی تعلقات کا نام تولی رکھا ہے اور اس قسم کے دوست کو ولی کہا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے کسی مومن کا کسی غیر مومن کے ساتھ (جسے قرآن کی اصطلاح میں کافر کہا جاتا ہے۔ اور جس میں کسی منافرت یا دشمنی کا جذبہ پنہاں نہیں) اس قسم کے تعلقات پیدا کرنا جائز ہے یا نہیں۔ قرآن کریم میں تولی کیلئے آیا ہے کہ۔

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی دوست۔ ولی ہیں۔

نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ بُرائی سے روکتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں ۹/ ۷۱

دوسری جگہ ہے۔

تمہارے دوست تو صرف اللہ اور اسکا رسول۔ اور ایماندار لوگ ہیں جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور ان میں خشوع ہوتا ہے ۵/ ۵۵

اِس کے برعکس غیر مسلموں کے متعلق فرمایا۔

اے ایمان والو۔ اپنے سوا کسی اور کو دوست (ولی) مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ وہ تمہاری ضرر رسانی کی تمنائیں رکھتے ہیں۔ بعض (منصوبے) تو ان کے مُنہ سے ظاہر ہو تے ہیں لیکن جسقدر ان کے دل میں چھپا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم آیات تمہارے سامنے ظاہر کر چکے ہیں اگر تم سمجھنے والے ہو تو۔ تم ان لوگوں سے محبت رکھتے ہو۔ مگر وہ کبھی تم سے محبت نہیں رکھتے۔ حالانکہ تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب یہ تم سے ملتے ہیں تو کہدیتے ہیں کہ ہم بھی ان باتوں کو مانتے ہیں اور جب تم سے الگ ہو تے ہیں تو تمہارے خلاف غصّے سے اپنی اُنگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں۔ کہدیجئے کہ جاؤ۔ اور اپنے غصّے میں مر مٹو۔ اللہ دلوں کے حالات سے باخبر ہے۔ اگر تمہیں کوئی اچھی بات پہنچ جائے تو انکے لئے موجب غم ہوتی ہے۔ اور اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو اس سے یہ خوش ہو تے ہیں۔ اگر تم استقلال سے رہو اور ان سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو (ان سے بچتے رہو) تو ان لوگوں کی تدابیر تم کو ذرا بھی ضرر نہیں پہنچا سکیں گی۔ اللہ انکے اعمال کو محیط ہے۔ ۳/ ۱۱۹-۱۲۰

یہ حقائق کسی تبصرہ یا تشریح کے محتاج نہیں واقعات ان کی تائید کے لئے کافی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ڈاکٹر مونجے اور مالوی جی کیا چاہتے ہیں۔ کون نہیں سمجھتا کہ مہاتما جی کا سب کچھ چھوڑ چھاڑ۔ اچھوتوں کے سُدھار۔ اور "ہندی ہندوستانی" کو ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے میں کیوں مصروف ہیں۔ کس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو

جب لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا تمدن ایک خاص وضع کے لوٹے اور ٹخنے سے اونچے پاجامہ سے زیادہ ہے کیا! تو انکا منشا کیا ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ واقعات سامنے نہ بھی ہوں۔ تو بھی ایک مسلمان کے لیئے جو قرآن کو خدا کی کتاب مانتا ہے ان میں کسی شک اور تردد کی گنجائش نہیں اس لیئے کہ آیات الٰہی تائیدات زمانہ کی محتاج نہیں۔ تائیدی دلائل غیر مسلموں کے لیئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس وقت ہم صرف مسلمانوں سے بات کر رہے ہیں۔ جنہیں یقین ہونا چاہیئے کہ جب انکا خدا غیر مسلموں کی قلبی کیفیات کو یوں بیان کر رہا ہو تو اس میں کسی شبہ کی گنجائش سمجھنا ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ اسی لیئے فرمایا کہ۔

جو لوگ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں ان کو تم کبھی نہ دیکھو گے کہ وہ ایسے
لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور رسول کے خلاف ہوں۔ گو وہ
انکے باپ۔ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں..... ۵۸/۲۲

مسلمان ملت ابراہیمی کا پیرو ہے اور قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ جناب ابراہیم علیہ السلام کے اعمال حیات میں مسلمانوں کے لیئے اسوۂ حسنہ ہے۔ یہ کس مقام پر فرمایا ہے قابل غور ہے

اے ایمان والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست مت بناؤ کہ انسے
دوستی کا اظہار کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ تمہارے پاس جو کچھ حق کے ساتھ
آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں...... اگر انکو تم پر دسترس ہو جائے تو وہ فوراً
تمہارے دشمن ہو جائیں گے۔ اور تم پر زبان اور ہاتھ سے مضرت رسانی پر اتر آئینگے
..... تمہارے لیئے ابراہیم اور انکے ساتھیوں (کی زندگی میں) ایک اسوۂ حسنہ ہے
جب انہوں نے اپنی قوم سے کہدیا کہ ہم تم سے اور جو کچھ تم خدا کے سوا پوجتے ہو
ان سے بیزار ہیں۔ ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لیئے عداوت
اور بغض ظاہر ہے۔ جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ...... ۶۰/۱-۴

فطرۃً سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تولی سے اتنی شدت سے کیوں روکا ہے۔ اگر یہ غیر مسلموں پر اعتماد اور بھروسہ کریں گے تو انکا کیا بگڑیگا۔ اس کی وجہ بھی قرآن کریم میں موجود ہے اور کتنی واضح طور پر موجود ہے۔ قرآن کریم کے اپنے الفاظ میں دیکھئے فرمایا

ودّوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء فلا تتخذوا منهم اولیاء.... ۴/۸۹

وہ لوگ اِس تمنا میں ہیں کہ جیسے خود کافر ہیں۔ اسی طرح تمہیں بھی کافر بنالیں
تاکہ تم اور وہ سب برابر ہوجاؤ۔ بس ان میں سے کسی کو دوست نہ بنانا۔

اِس میں یہ ٹکڑا "فتکونون سواء" قابلِ غور ہے یعنی غیر مسلموں کی اور منافقوں کی (کہ یہاں منافقوں کا ذکر چلا آرہا ہے اور قرآن کریم کی رو سے منافقت اور کفر ایک ہی چیز ہے۔) ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ تم کو اپنے جیسا کرلیں۔ اور تم سب اس طرح برابر ہو جاؤ۔ ایک جیسے ہو جاؤ۔ کیا کانگریس کا یہی نصب العین نہیں کہ ہندوستان کی اقلیتیں اپنے مخصوص امتیازی شعائر کو چھوڑ کر۔ جن کی وجہ سے وہ الگ اقلیتیں کہلاتی ہیں، ایک قوم بن جائیں یعنی قوم غالب میں مدغم ہوجائیں اور کیا "قومیت پرست" حضرات کا یہی وعظ نہیں کہ مسلمانوں کو تنگ نظری چھوڑ کر کشادہ ظرفی اختیار کرنی چاہئے۔ اور انہیں پہلے ہندی اور بعد میں مسلمان بننا چاہئے۔ اور پھر پنڈت جواہر لال نہرو کا ملک کے نوجوانوں کو مذہب سے بیگانہ۔ بلکہ متنفر بنادینا اسی غرض کے لئے نہیں کہ ہندو مسلمان سب قومیت کو اپنا بنالیں۔ اور مسلمان جس چیز کو اپنا مخصوص تمدن بنائے بیٹھا ہے۔ اسے ان کی نظر کے مطابق اعلیٰ مفاد کی خاطر قومیت کے سمندر میں ڈبو دے۔ حالانکہ مسلمان کا امتیازی نشان ہی اسی میں ہے کہ وہ صرف خدا کے رنگ میں رنگا ہو صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ (اللہ کا رنگ۔ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کون رنگ ہو سکتا ہے) یعنی اس کے لئے امتیازی نشان اس کے خدا کے مقرر کردہ شعائر ہوں۔ جسے قرآنی تمدن کہا جائے گا۔ اور یہی وہ امتیازی زندگی ہے جو ایمان و عمل صالح سے ملتی ہے۔

یا ایھا الذین امنوا۔ ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا $\frac{8}{29}$

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو وہ تمہیں ایک امتیازی زندگی عطا کریگا

یعنی مسلمان اس وقت تک ہی مسلمان ہے جبتک وہ اپنا الگ امتیازی نشان رکھتا ہو۔ اس کی زندگی ہی امتیازی ہو۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دوسروں کے اندر جذب ہو جانا ہی قابلِ فخر ہے۔ جب برابر اور یکساں ہو جانا ہی اصلی غایت ہے۔ تو پھر یہ "فرقان" یہ امتیازی رنگ کہاں رہے گا!!

البتہ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے مودت کی اجازت ہے جو تولّی سے بالکل الگ شے ہے لیکن وہ بھی ان حالات میں جبکہ مسلمان احسان اور عدل کرنے کی قوت رکھتے ہوں

یعنی بالا دست ہیں فرمایا۔

اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان اور انصاف سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور جنہوں نے تمکو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ ۶۰/۸

ان تمام آیات کو اور اسی قبیل کی متعدد آیات کو جو قرآن کریم میں جابجا مذکور ہیں ساتھ ملاکر دیکھنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہوجاتی ہے کہ ایک مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم سے تولّی۔ دلی دوستی۔ بلا ضمانت و شرائط۔ اعتماد اور بھروسہ کے تعلقات کسی طرح بھی جائز نہیں نہ صرف یہ کہ جائز ہی نہیں بلکہ اس کی بڑی شدّت سے مخالفت کی گئی ہے۔ بڑی تاکید سے روکا گیا ہے۔ اب جو حضرات ہندوؤں کے ساتھ بلاشرائط و ضمانت اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ تولّی کے قائل ہیں عملاً اسپر کار فرما ہیں۔ اور دوسروں کو اس کی تلقین کرتے ہیں وہ دو صورتوں سے خالی نہیں۔

(۱) اگر وہ فی الواقع ہندوؤں کے ساتھ قلبی رابطۂ اتحاد تولّی کو قائم کئے ہوئے ہیں تو یہ چیز قرآن کریم کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف ہے جسکی کوئی تاویل نہیں کیجا سکتی۔ اور

(۲) اگر وہ ہندوؤں کے ساتھ دلی دوستی نہیں رکھتے بلکہ اسوۂ ابراہیمی کے ماتحت ان کی ہندوؤں سے "ابدی عداوت اور بغض ہے" تو ہندوؤں کو خود سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ان کو اور اپنی قوم کو کسقدر فریب دے رہے ہیں۔ ہندوؤں کو چاہیئے۔ اور مسلمانوں کو سب سے پہلے چاہیئے کہ وہ "قومیت پرست" حضرات سے واضح طور پر پوچھیں کہ انکے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ کس قسم کے ہیں۔ دلی تعلقات ہیں یا محض ظاہر داری کے۔ معاملہ صاف ہو جائے گا یا انھیں ہندوؤں سے الگ ہونا پڑیگا یا مسلمانوں سے۔ یہ بین بین کا راستہ کہ

گاندھی جی بھی خوش رہیں۔ راضی رہے قرآن بھی

چل نہیں سکیگا۔ آج تک کسی "قومیت پرست" مسلمان نے اس مسلک کو واضح نہیں کیا اور اسی کی سخت ضرورت ہے۔ یا وہ غیر مسلموں کے ساتھ تولّی کو جائز ثابت کریں۔ لیکن قرآن سے تو یہ جائز ثابت ہونے سے رہا۔ فَأْتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

اب ایک آخری دلیل باقی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب مسلمان کو حکم ہے تعاونوا علی البر والتقوٰی (یعنی نیکی اور تقوٰی کے کاموں میں معاونت کرو) تو مسلمانوں کو موجودہ جنگ آزادی میں ہندوؤں کی معاونت ضرور کرنی چاہیئے کہ یہ برّ اور تقوٰے کا کام ہے۔ سو پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ یہ فی الحقیقت برّ اور تقوٰی کا کام ہے بھی یا نہیں یہ ظاہر ہے کہ جس قسم کی آزادی کا تصور ہندو کے دھیان میں ہے وہ مسلمان کے نزدیک آزادی ہی نہیں۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جب معاشی آزادی ملجائیگی تو مسلمان کا اس میں کچھ تو حصہ ضرور ہوگا سو اوّل تو یہ بات بھی محل نظر ہے کہ مسلمان کا اس میں کچھ حصہ ہوگا بھی یا اس کی حالت ایسی ہی رہے گی لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اسوقت مسلمان کی معاشی حالت کچھ سدھر جائیگی تو دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت مسلمان ہندوستان میں کہیں موجود بھی ہوگا۔ جس روش پر مذہب کے خلاف تحریک بڑھائی جارہی ہے۔ جس نہج پر مسلمان نوجوانوں کو مذہب سے متنفر کیا جارہا ہے اس سے تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی مدافعانہ قوت بروئے کار نہ لائی جائے تو بیس سال کے اندر اندر ہندوستان میں مسلمان۔ مسلمان کی حیثیت سے باقی ہی نہیں رہے گا۔ ہندی کی حیثیت سے باقی رہے گا۔ تو اس وقت اگر معاشی حالت کچھ بہتر بھی ہوگی تو ایک ہندی کی ہوگی۔ ایک مسلمان کی نہیں ہوگی۔ اور اگر ایک مسلمان نے اپنی امتیازی خصوصیتیں کھو کر معاشی۔ فلاح حاصل بھی کرلی تو "مسلمانوں" کو اس سے کیا خوشی۔ آج لفظ "ٹوڈی" اسی لیئے اسقدر گھناؤنا نظر آتا ہے کہ ایسا شخص گویا اپنی معاشی خوش بختی کی خاطر اپنی اسلامی خصوصیت کو مٹا ڈالتا ہے۔ اگر یہی چیز آزادی کے بعد بھی رہی (اور آج تو انفرادی حیثیت سے ہے اس وقت اجتماعی رنگ میں ہوگی) تو مسلمان کو اس آزادی سے کیا مسرت! مسلمان معاشی نکبت سے اس لیئے نالاں ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی قوم اسلام بیچ ڈالتی ہے اور معاشی خوشحالی اس لئے چاہتا ہے کہ اس کا اسلام منڈی میں آنے سے بچ جائے۔ لیکن اگر معاشی خوش بختی حاصل ہی ہو اسلام کی فروخت سے تو اس خوش بختی کو ایک سچا مسلمان لیکر کیا کرے!! مسلمان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے۔

اگر اس کا نام "مٹا کر" یہ اچھی زندگی بسر کر رہا ہے تو اس زندگی سے تو موت بہتر۔
اس قسم کی آزاد حکومت کا قیام جس میں قرآن محبوس رہے۔ مسلمان اپنی ملی خصوصیات کو مٹا ڈالے۔ مسلم و غیر مسلم برابر ہو جائیں۔ یقیناً ایسا ہی "اثم و عدوان" ہے۔ جیسا کسی اسلام کی مخالف حکومت کے استحکام میں کچھ امداد کرنا۔ اور اگر تعاونوا علی البر والتقویٰ کے ساتھ ساتھ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ بھی خدا ہی کا حکم ہے تو اس نئی "آزاد" حکومت کے حصول میں معاونت کیسے جائز ہو جائے گی؟
لہذا مسلمان قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق تحریک آزادی میں تعاون اسی صورت میں کر سکتا ہے کہ
(۱) کانگریس۔ جو اکثریت کے اعتبار سے ہندوؤں کی ہی جماعت ہے اور انہی کی جماعت رہے گی واضح الفاظ میں بیان کر دے کہ آزادی سے ان کا مفہوم ایسی مکمل آزادی ہے جو مسلمان کے لیے معاشی آزادی کے ساتھ ساتھ مذہبی آزادی کا بھی حکم رکھتی ہو۔ یعنی
(۲) حصول آزادی کے بعد مسلمان کا قرآن آزاد ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں کے تمام معاملات قرآنی قوانین کی رو سے فیصل ہو سکیں گے۔
(۳) ممالک اسلامیہ کے ساتھ ہندوستان کی حکومت کی وہ روش ہو گی جو خود مسلمان طے کیا کریں گے۔
ان اصولوں کا جزئی تصفیہ مسلمانوں کی جماعت سے کر لیا جائے۔ نہ یہ کہ مسلمانوں کو فرداً فرداً شمولیت کانگریس کی دعوت دی جائے۔ ہمارے مخاطب اس وقت مسلمان ہی ہیں۔ انھیں چاہیے کہ من حیث الجماعت ان امور کا کانگریس کی اکثریت سے فیصلہ کر کے پھر کانگریس کی تحریک آزادی سے تعاون کریں۔ فرداً فرداً اکثریت میں جا کر گم ہوتے جانا تو خودکشی ہے۔

یاد رہے کہ اسلام اور محکومیت دو متضاد چیزیں ہیں۔ جو مسلمان محکومیت پر قانع ہو جاتا ہے اسے اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس لیے مسلمان کو تو مسلمان بننے کے لیے حصول آزادی کی ضرورت ہے۔ یہ آزادی کی جنگ میں پیچھے کیسے رہ سکتا ہے۔ اس نے تو دنیا کو سکھایا ہے کہ آزادی کے لئے جنگ کیسے

کی جاتی ہے۔ لیکن آج ہندوستان کے مسلمان ایک وسیع و عریض صحرا میں ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ دریا کی ایک موج آتی ہے اور ان میں سے کچھ ذرات اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ دو سکنڈ کے لئے دریا کا پانی خاک آلودہ سا ہو جاتا ہے۔ یہ ذرے سمجھتے ہیں کہ ہم دریا پر غالب آ گئے۔ لیکن چار ہی قدم پر جا کر یہ ذرے یا تو اس میں جذب ہو جاتے ہیں یا سطح کے نیچے بیٹھ جاتے ہیں اور پھر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اگر یہی ذرے اپنی تنظیم و مرکزیت سے ایک جگہ سمٹ کر اکھٹے ہو جائیں تو ایک محکم چٹان بن سکتے ہیں کہ بڑی سے بڑی موج بھی آئے تو اپنا سر ٹکرا کر لوٹ جائے۔ پہلی حالت جو تشتت و انتشار کی حالت ہے۔ لامرکزیت کی حالت ہے وہ شرک کی حالت ہے جس کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

> اور جو اللہ سے شرک کرتا ہے (اس کی حالت) یوں سمجھئے کہ وہ گویا آسمان (کی بلندیوں) سے (زمین کی پستیوں پر) آ گرا۔ یا اسے کوئی پرندہ اچک کر لے گیا یا ہوا کا طوفان اسے کسی دور دراز مقام پر اڑا کر لے گیا (یعنی وہ اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا رہا) ۲۲/۳۱

اسی لئے کہ قرآن کریم میں بصراحت موجود ہے کہ انتشار و افتراق۔ تشیع و تحزب۔ دراصل شرک کی حالت ہے۔ اور دوسری حالت ایمان کی ہے جس کے متعلق ارشاد ہے کہ۔

> یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان سے دوسرے لوگوں نے کہا کہ دشمنوں نے تمہارے خلاف بہت سا ساز و سامان جمع کر رکھا ہے۔ ان سے ڈرو۔ تو اس سے ان کا ایمان اور بھی بڑھ گیا۔ اور کہنے لگے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے۔ اور وہی بہترین کارساز ہے۔ ۳/۱۷۲

مسلمانوں کی زندگی کا راز۔ بشرطیکہ انھوں نے مسلمانوں کی سی زندگی بسر کرنی ہو۔ آج ان کی مرکزیت کے اندر ہے۔ آج اسلام کا سچا خیر خواہ وہی ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کے اندر مرکزیت پیدا کر دے ورنہ ان ریت کے ذروں کو دریا کے اندر ملنے کی دعوت دینا۔ ان کو زہر دینے کے مرادف ہے۔ یاد رہے کہ ایک ڈھیلا جب پانی میں پھینکا جائے تو وہ ذرا سی آواز بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے پانی کے کچھ چھینٹے بھی اڑتے ہیں۔ دو چار لہریں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد اس ڈھیلے کی موت ہوتی ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے موت!! موجودہ "قوم پرست" حضرات میں سے ممکن ہے بعض

اس فریب میں بھی ہوں کہ ان کی وجہ سے دریا میں کچھ ہلکورے پیدا ہورہے ہیں لیکن یہ سب عارضی ہیں۔ انہی کے اندر ان کی موت کا راز پوشیدہ ہے۔
اگر مسلمان زندگی چاہتے ہیں تو انکے لیئے ایک ہی پیغام ہے کہ ؎

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی
مزی چوں خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

جو اللہ کا بندہ آج مسلمانوں کے بکھرے ہوئے ذرّوں کو ایک محکم چٹان میں بدل دے اور اس طرح انھیں اس اُمنڈتے ہوئے سیلاب سے بچالے۔ وہی اسلام کا سچا خدمت گزار ہے۔ جب یہ حالت ہوجائے گی تو پھر دوسری جماعتیں خود بخود ان کے جذبات کا احترام کریں گی۔ ان سے میثاق و وفاق کی ضرورت سمجھیں گی انھیں ایک جماعت تسلیم کریں گی۔ ان سے معاہدے کرکے اشتراکِ عمل حاصل کریں گی۔ اور پھر ان میں وہ قوت بھی موجود ہوگی کہ یہ اُن معاہدوں کو پورا ہوتا بھی دیکھ لیں اس راستہ کے علاوہ کوئی اور راستہ "صراطِ مستقیم" نظر نہیں آتا۔
ان کنتم تعقلون۔

باب المراسلت

اکل حلال!

(جناب سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، مدیر ترجمان القرآن)

ذیل میں ایک خط اور اس کا جواب شائع کیا جاتا ہے، یہ خط میرے نام سے ایک صاحب نے بھیجا۔ میں جانتا ہوں کہ اس زمانہ میں اکثر حضرات کو اس قسم کی دقتیں پیش آتی ہیں، اور ان دقتوں کا میری دانست میں یہی ایک حل ہے جو میں نے اپنے اس نوجوان مستفسر کو سمجھایا ہے۔ لہٰذا اس خط اور اس کے جواب کی اشاعت انشاء اللہ خالی از فائدہ ثابت نہ ہوگی۔

جناب سید صاحب السلام علیکم

دارالاسلام کے پراسپکٹس کے لیئے تو مجھے آپ کے منیجر صاحب کو لکھنا چاہیئے تھا لیکن مجھے آپ سے بھی کچھ پوچھنا تھا۔ اس لیئے آپ کو یہ مزید تکلیف دیتا ہوں کہ آپ انہیں ایک کاپی پراسپکٹس کی میری طرف بھیجنے کو بھی کہہ دیں بہت مہربانی ہوگی۔

۱۹۳۵ء میں میں نے ایل ایل بی کیا تھا۔ آج کل پریکٹس کے لیئے لازمی ہے کہ چھ ماہ پہلے کسی تجربہ کار وکیل کے ساتھ رہ کر کام سیکھا جائے پھر اُسکے سارٹیفکیٹ پر ہائی کورٹ اُسے انڈی پنڈنٹ کام کی اجازت دیتی ہے۔ وہ اجازت بھی میں نے لے لی۔ اس دوران (apprenticeship) اور زمانہ مابعد میں موجودہ پریکٹس کے طُرق اور ذرائع کا میں بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اور جس نتیجہ پر آخر میں پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ احکام قرآنی کے عین مطابق یا اُنکے قریب قریب اپنی زندگی کے دن گزارے اُس کے لیئے مشکل کیا ناممکن ہے کہ ایک دن بھی ان عدالتوں میں جا کر اپنی روزی کا سامان پیدا کر سکے۔ مقدمہ کی ہر سٹیج پر جھوٹ کی اتنی آمیزش کرنا لازم ہو جاتی ہے جتنی وکیل صاحب کو اپنی روزی کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ خواہ وہ مستغیث کیطرف سے ہو یا ملزم کیطرف سے۔ یہ حقیقت شب دیجور کی طرح واضح ہے کہ مقدمہ کی کامیابی راستی پر نہیں۔ بلکہ کذب و افترا پر مبنی ہے۔ Touting کا مرض تو ایک عام مرض ہے لیکن میں فی الحال اُسے چھوڑتا ہوں۔ میرا روئے سخن صرف مقدمہ کے مختلف مراحل کیطرف ہے۔ جن پر وکیل صاحبان کو بے اختیار ہو کر مقدمہ کی کامیابی کی خاطر جھوٹ سکھانا جھوٹ

بلانا۔ اور جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ لیکن آپ سے پوچھتا ہوں کہ محض فیس مقدمہ کی خاطر اتنا گناہ عظیم اپنے سر لینا کسی صورت میں قابل معافی ہو سکتا ہے۔ جب وکیل صاحب کے لئے اور کوئی چارہ کار بھی نہ ہو میرا (Moral Conviction) ہے کہ فی زمانہ وکلاء سند یافتہ ڈاکو ہیں۔ وہ بچانوے فیصدی جرائم کرتے ہیں جنکی تعریفوں اور سزاؤں سے تعزیرات ہند بھری پڑی ہے۔ اور میں خود اسی کام کے لئے تعلیم لیکر یہاں آیا ہوں یہ آج کل ناممکن ہے کہ کوئی وکیل اپنا دامن بچائے بھی رکھے اور وکالت کا کام بھی کرتا رہے ہاں پندرہ بیس برس کی شیطانی حرکات کے بعد اسکا کام چل نکلے اور وہ (original work) چھوڑ کر محض اپیلیں ہی لینا شروع کردے تو اس وقت وہ کہہ سکتا ہے کہ میں مقابلتہً حلال کی روزی کما رہا ہوں لیکن اپنی پریکٹس کے پہلے پندرہ بیس برس اس کی عاقبت سوزی کے لئے کچھ کم نہیں۔

میرے تمام اقربا مجھے یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اب اتنا زر کثیر صرف کر کے جو تعلیم لی ہے اس سے استفادہ بھی کرنا چاہئے۔ لیکن انکے یہ مشورے مجھے نہیں بھائے۔ اس سال مجھے حج بیت اللہ کا بھی موقع نصیب ہو گیا۔ وہاں منیٰ کے مقام پر ایک صاحب اسی موضوع پر ایک آیۃ شریفہ بھی مجھے سنا گئے جس کا مفہوم جتنا مجھے یاد رہا ایسا ہی تھا کہ ان لوگوں کی روزی حرام ہے جو دو فریقوں کو قاضیوں یا منصفوں کے پاس لیجاتے ہیں اور حقیقت کا اخفا اور جھوٹ کا اظہار کرتے ہیں لیکن چونکہ عربی زبان سے نابلد ہوں۔ اس آیت شریفہ کے الفاظ ذہن میں محفوظ نہ رکھ سکا میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کس پارہ میں آئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالباً تیسرے پارہ میں۔ لیکن اس میں تو مجھے کہیں نہیں ملی۔ آپ کو یاد ہو تو لکھدیں وہ بھی ایک مزید ضمنی دلیل ہو جائے گی۔

لیکن آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ان حالات کے موجود ہوتے ہوئے جنکا میں نے ایک نہایت سرسری الفاظ اور مختصر سے پیرایہ میں نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ جو فی الحقیقت ان گھناؤنے حقائق کا ایک پہلو بھی پوری طرح ظاہر نہیں کرتے ہیں میرے لئے اپنے آپ کو ایک ایسے کام پر لگا دینا کہاں تک مناسب ہے۔ جس وقت اور راہیں بھی بظاہر مسدود ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آپ میرا یہ سوال دیکھکر جو اگرچہ چنداں وضاحت کے ساتھ یا مدلل طور پر تو نہیں لکھا جا سکا مجھے جواب سے فخر بخشیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کا یہ جواب ہی میرے اس indecision کا کوئی حل پیش کر دے۔ والسلام۔

جواب

محترمی! السلام علیکم! عنایت نامہ مورخہ ۲۸ مارچ وصول ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو کسب معیشت کے طریقوں میں حرام اور حلال کی تمیز کرنا چاہتے ہیں ورنہ مادہ پرستی جس طرح ذہنیتوں پر چھائی ہوئی ہے اُس کا اثر تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کیا جدید تعلیمیافتہ اور کیا قدیم تعلیمیافتہ سب کے پیش نظر جلب منفعت اور کسب زر ہے اور جو طریقہ زیادہ پُر منفعت نظر آتا ہے۔ اُس میں حرام و حلال کی تمیز کرنے کو حماقت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وکالت کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ حقیقت سے کچھ کم ہی ہے۔ زیادہ نہیں ہے وکیل اگر اس نیت سے اور اس شرط کے ساتھ کام کرے کہ حقدار کو اس کا حق دلوانے میں قانونی مدد کرے گا تو اس کا پیشہ جائز ہے اور اگر اس نیت سے بیٹھے کہ جو شخص اُس کو پیسہ دے گا۔ خواہ وہ برسر حق ہو یا برسر ظلم، بہر حال یہ اُس کی مقصد برآری میں مدد دے گا، تو یہ اُسکے پیشہ کو اُصولاً حرام کر دے گا۔ لیکن "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"[1] وہ اصل الاصول ہے جو تمام دُنیاوی معاملات میں قرآن نے پیش کیا ہے۔ اور اسکی خلاف ورزی بہر حال ایک معصیت ہے اب اس معصیت کی راہ اختیار کر کے آدمی جس جس درجہ کے مرتکبین حرام کے ساتھ تعاون کرے گا۔ اُسی درجہ کے حرام کا گویا وہ خود مرتکب ہوگا۔ اگر آپ نے سُود خوار کو سُود دلوایا تو گویا خود سود خواری کے مجرم ہوئے اگر زانی کو سزا سے بچایا تو خود زنا میں معین ہوئے۔ اگر غاصب کو کسی جائز ملکیت پر قبضہ دلایا تو خود غصب میں شریک ہوئے وقس علیٰ ہذا۔

آپ کی روح مجھے سعید معلوم ہوئی ہے۔ اس لیئے میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں۔ اس پر آپ غور کریں گے تو آپ کو اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

انسان کے لیئے دُنیا میں دو راستے ہیں۔ اگر وہ آخرت پر اعتقاد نہیں رکھتا۔ اور خدا کے سامنے حاضر ہونے اور اپنی دُنیوی زندگی کے اعمال کی جواب دہی کرنے کا اُس کو کوئی خیال نہیں اور کامیابی اور ناکامی کا معیار اُس کی نگاہ میں صرف اِس دُنیا کی خوش حالی و بد حالی ہے تو اُس کو حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی اخلاقی و مذہبی قیود کو بالکل نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ اور پُوری تندہی کے ساتھ دولت دُنیا

---

[1] نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو۔ اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو

سمیٹے اور اس سے لذت و عیش کے سامان فراہم کرنے میں لگ جانا چاہیے، اُس کے لیے حرام وہ ہے، جو حصولِ منفعت اور طلب لذات میں مانع ہو، اور حلال وہ ہے جو اس میں معاون ہو، اور اگر وہ آخرت پر یقین رکھتا ہے اور خدا کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتا ہے اور اُس کے نزدیک کامیابی یہ ہے کہ خدا کی آخری عدالت میں وہ کم از کم من حیث المجموع نیکو کار ٹھہرے اور ناکامی یہ ہے کہ آخری Balance Sheet) میں وہ خائب و خاسر (Bankrupt) نکلے، تو پھر دنیوی زندگی میں اُسے اپنے نقطۂ نظر میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اس کو پھر اپنی کامیابی و ناکامی کا اندازہ اس لحاظ سے نہ کرنا چاہیے کہ اُس نے کس قدر خوش حالی حاصل کی، کیسے کپڑے پہنے، کیسے مکان میں رہا، کیسا کھانا کھایا اور کس قدر اسباب تعیش فراہم کیے۔ بلکہ اس لحاظ سے اندازہ کرنا چاہیے کہ اپنے واجبات کو ادا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا، لوگوں کے حقوق اور خدا کے حقوق سے کہاں تک سبکدوش ہوا۔ اور افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی بال سے زیادہ باریک راہ پر قائم رہنے میں کہاں تک کامیابی اُس نے حاصل کی۔ زندگی کا یہ نقطۂ نظر جب وہ اختیار کرے گا تو پیوند لگے ہوئے کپڑوں اور سوکھے ٹکڑوں میں اُس کو وہ اطمینانِ قلب نصیب ہو گا جو حرام کھانے والوں کو حریر و دیبا پہنے اور الوان نعمت کھانے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔

برادرم دنیا میں خدا کا رزق فراواں ہے۔ رزق بجائے خود طیب و طاہر ہی ہے۔ اب انسان کی اپنی پسند پر موقوف ہے کہ حرام طریقہ سے اُس کو حاصل کرے یا حلال طریقہ سے، یہ چور کی اپنی دوں ہمتی ہے کہ جو پاک روٹی اس کو پاک ذریعہ سے مل سکتی تھی۔ اُس نے ناپاک ذریعہ سے اُس کو نجس کر کے کھایا۔ دُنیا میں پاک ذرائع بھی اِس کثرت سے موجود ہیں جس کثرت سے ناپاک ذرائع موجود ہیں۔ اگر آپ اپنی نیت کو پاک کر لیں اور اتنا عزم اپنے اندر پیدا کر لیں۔ کہ اپنے ضمیر کے خلاف کوئی Temptation) آپ کے قدم لغزش پیدا نہ کر سکتا ہو، تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ناپاک ذرائع زیادہ مشکل اور پاک ذرائع زیادہ آسان ہیں۔ اور اگر نیت میں ناپاکی موجود ہو یا عزم موجود نہ ہو تو پھر ناپاک ذریعہ آسان، اور ہر پاک ذریعہ مشکل نظر آئے گا، نیک نیت اور سچے عزم والے آدمی کے لیے سڑک پر بیٹھ کر جوتی گانٹھنا آسان اور لوگوں کے حقوق مار کر ڈپٹی بننا دشوار ہے۔ بخلاف اس کے بدنیت اور کم حوصلہ آدمی کو رزق حرام کے دریا بہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور رزق حلال تلاش کرنا اُسے جوئے شیر سے زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔

یہ ہے اصلی صورتِ حالات۔ اب آپ لوگوں سے مشورہ کرنے اور اُن کی مختلف آوازوں پر کان

دہریت کے بجائے صرف اپنے دل کی طرف نگاہ کیجیے، اور اس کو ٹٹول کر دیکھیے کہ اس کا میلان کس طرف ہے۔ اور پھر اگر وہ اسلامی نقطۂ نظر کیطرف مائل ہو تو یہ دیکھیے کہ آیا اس میں اتنا عزم بھی موجود ہے۔ کہ وہ رزق حلال کی ایک نانِ جویں کو رزق حرام کے خزانوں سے زیادہ قیمتی سمجھے گا۔ اس امتحان میں اگر آپکا قلب پورا اترے تو مسلمان کی زندگی اختیار کیجیے۔ اللہ تعالےٰ یقیناً آپ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے گا۔ اور اگر اس امتحان میں آپ کو محسوس ہو جائے کہ آپکا قلب بودا ہے تو پھر ٹھیٹھ مادہ پرست بنجایئے۔ اور خدا و آخرت کا خیال دل سے قطعی نکال دیجیے۔ تاکہ کم از کم دوسرے ہی راستے میں آپ انتہا کو پہنچ سکیں۔ بیچ کے مقام پر ٹھیرنے کا میں آپ کو کبھی مشورہ نہ دوں گا۔ کیونکہ جو شخص آدھا اِدھر اور آدھا اُدھر ہوتا ہے وہ دہرے نقصان میں ہے۔ نہ مسلمان ہی کی حیثیت سے کامیاب اور نہ مادہ پرست ہی کی حیثیت سے کامیاب!

دارالاسلام کا پراسپکٹس آپنے طلب فرمایا ہے۔ اگر شوال ۱۳۵۶ھ کا ترجمان القرآن آپ دیکھ چکے ہیں یا مارچ ۱۹۳۸ء کا پیغام حق ملاحظہ سے گزرا ہے۔ تو اسی کو پراسپکٹس سمجھیے۔ اور اگر ان میں سے کوئی پرچہ آپ کو نہیں ملا ہے۔ تو لکھیے تاکہ یہاں سے بھیج دیا جائے +

دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ (پنجاب) — خاکسار ابوالاعلیٰ

(ہمارے بھائی نے صرف وکالت کے پیشہ کا ہی ذکر کیا ہے کہ یہی چیز ان کی اپنی ذات سے متعلق تھی لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ جب رزق کی تقسیم خدا کے مقرر کردہ نظام کے بجائے انسانی ہاتھوں میں چلی جائے تو موجودہ ماحول میں بمشکل کوئی شعبہ ایسا ملے گا جس میں کوئی نہ کوئی ایسی خرابی نہ نکل آئے۔ جس کا ذکر استفسار میں کیا گیا ہے۔ لہٰذا صحیح احساس رکھنے والے مسلمان کا تو نصب العین ہی یہ ہونا چاہیے کہ اس ماحول کو بدل کر دنیا میں پھر سے وہی خدائی نظام قایم کیا جائے جس کا مکمل دستور اساسی خدا کی آخری کتاب ہے۔ لیکن اس کے لیے سب سے پہلے اس عزم راسخ والے قلب مومن کی ضرورت ہے۔ جس کی طرف مودودی صاحب نے ارشاد فرمایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا قلب آج اس تمام ماحول کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن جو اس جد و جہد میں فنا ہو گیا۔ اسی کو درحقیقت بقا ہو گئی۔ ہلاکت تو اسکے لیے ہے جو اس ماحول کے ساتھ نہ چلنے میں ہی راز زندگی سمجھ لے۔ گڑھے میں گر جانے اور گر کر اطمینان سے بیٹھ رہنے میں بڑا فرق ہے اس سے نکلنے کی تڑپ بھی ایمان ہے۔ طلوع اسلام)

تکلف برطرف :-

از زرآزی

"نئے جال لائے پرانے شکاری"

جب سے ہندوستان میں اشتراکیت کی وبا پھوٹی ہے ہر ادیب اپنے مضمون میں ہر افسانہ نگار اپنے افسانہ میں اور ہر شاعر اپنی نظموں میں سرمایہ داری کی لعنت اور مزدور کی حمایت میں چشم پرنم اور آہ برلب دکھائی دیتا ہے اور چونکہ اس نظریہ کی ابتداء موجودہ تحریک آزادی کے ایک قاید سے ہوئی ہے اس لئے ہمارے قوم پرست شعراء حضرات تو اس دل سوزی اور جگر گدازی سے مزدور کی بپتا بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچارے دن بھر کلیجہ تھامے ایک ایک بھوکے۔ ایک ایک نادار۔ ایک ایک مصیبت زدہ کی دکھ بھری کہانی سُن سُن کر خون کے آنسو بہاتے ہونگے اور مزدور کی ستم رسیدگی کا تصور راتوں کو انکی نیند حرام کردیتا ہوگا۔

مرزا سودا کو ساغر دیکھکر کسی کی "کیفیت چشم" یاد آتی تھی۔ حافظ پیالہ میں "عکس رخ یار" دیکھتا تھا۔ لیکن ان حضرات کو چائے کے پیالہ اور روٹی کے ٹکڑے میں کسی مفلوک الحال بیمار مزدور کی حسرت بھری نگاہیں اور کسی "پتھر کوٹنے والی" کا مرجھایا ہوا زرد و زرد خشک چہرہ نظر آتا ہوگا۔ کوئی دو برس ادھر کا ذکر ہے کہ ہمیں شملہ کی چوٹیوں پر ایک مشاعرہ میں اسی قسم کے ایک اشتراکی انقلاب پسند شاعر کا کلام سوز التیام سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ صاحب نہایت درد و اثر میں ڈوبی ہوئی اپنی ایک نظم سنا رہے تھے۔ موضوع یہ تھا کہ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں ایک سٹیشن پر دو گاڑیاں آمنے سامنے آکر رکیں۔ اور اتفاق سے ایک سیکنڈ کلاس کا ڈبہ دوسری گاڑی کے تھرڈ کلاس کے ڈبہ کے مقابل آکر ٹھہر گیا۔ اب انہوں نے سیکنڈ کلاس کے سرمایہ داروں کے عیش و تنعم کا موازنہ سامنے کے تھرڈ کلاس کے مزدوروں اور غریبوں سے اس انداز سے کر کے دکھایا کہ ہال میں سناٹا چھاگیا۔ سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ سرد آہوں سے محفلِ مشاعرہ بزم ماتم بن گئی۔ اس دردناک منظر کا سامعین پر دن بھر اثر رہا۔ شام کی گاڑی سے شعراء حضرات واپس آرہے تھے لوگ ان کو الوداع کہنے کے لئے سٹیشن پر گئے۔ اشتراکی حضرت لوگوں کے توجہات کے خصوصیات کے ساتھ مرکز بن رہے تھے۔ مزدور۔ سرمایہ دار۔ سیکنڈ کلاس۔ ظلم ستم۔ انقلاب۔ اس قسم کے الفاظ ادھر اُدھر سے کان میں پڑ رہے تھے کہ ریل نے سیٹی دی۔ اور وہ اشتراکی حضرت مسکراتے ہوئے ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں سوار ہوگئے۔ جب سمجھ میں آیا کہ انہوں نے تھرڈ کلاس کے مزدوروں کا منظر کہاں سے دیکھا تھا۔

اور اس پر بھی مزدوروں کو شکایت ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی غمخوار نہیں۔ پتہ نہیں ان کو اور کس قسم کے غمخوار مطلوب ہیں۔ اے کاش کوئی ان احسان ناشناس جاہلوں کو سمجھا سکے کہ چونکہ غمخواری بھی ایک فن ہے

جسے اب سائنٹفک طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے اس لئے پرانے وقتوں کے اناڑی غمخواروں کے مقابلہ میں یہ لائسنس یافتہ حضرات بہر حال انسانیت کے دورِ ترقی کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا مستحق شکریہ۔ نہ مستوجبِ شکایت۔ اگر ان کی مساعیِ جمیلہ کے باوجود مزدور کی حالت بہتر نہ ہو تو اسے اپنے مقدر سے گلہ کرنا چاہئے نہ کہ معالج کی فنی قابلیت میں شبہ!

سچ کہا ہے کسی نے کہ سرمایہ داری تو لعنت تھی ہی لیکن اس قسم کی اشتراکیت بھی کچھ کم لعنت نہیں!!

حسابِ بیباق

مقابل کفر کے تھی وہ نمودِ اسلام کی اکبرؔ
مگر اب انقلابِ دہر سے باقی کہاں کافر

نصاریٰ قبلۂ مقصود ہیں ہندو برادر ہیں
زمینِ شعر میں بس رہ گئی زلفِ بتاں کافر

پیدائشی اچھوت

پچھلے دنوں مسٹر ساورکر، صدر ہندو مہاسبھا نے اپنے خطبۂ صدارت کے دوران میں فرمایا:۔

"ہم ہندو ان لوگوں کو ووٹ دے کر خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں جو علانیہ طور پر کہتے ہیں کہ وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ اور ساتھ ہی وہ مسلم جماعتوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان سے راہ و رسم بھی رکھتے ہیں اور ہندوؤں کے نام پر ہندوؤں کے مفاد کے خلاف ان سے سمجھوتے بھی کرتے ہیں؟"

پتہ نہیں پوجیہ پردھان جی کو اس بات میں کونسی خطرے کی بو آئی۔ اگر ایک مسلمان اپنے آپ کو کہتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے تو یہ اعلان تو ایک ہندو کے لئے خوشی کا موجب ہونا چاہیئے۔ اور اگر ایک ہندو یہ کہتا ہے کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ تو اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایک ہندو ایک بار چھوڑ لاکھ بار کہے کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ وہ ہندو ہی رہے گا۔ ہندو مت اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ سند ملاحظہ ہو۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی خود نوشت سوانح عمری کی جلد اول صفحہ ۳۰۳ و ۳۰۴ پر ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ہندو مت کے دائرے میں بیحد مختلف اور متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنی میں لفظ مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم فلسفی چارودک تھے) لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں۔ ہندو مت ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں چاہے مذہبی اور سماجی رسموں سے متعلق میرے خیالات اور اعمال کچھ ہی ہوں۔"

تو معلوم ہوا کہ مسٹر ساورکر کے لئے اصل خطرہ کی وجہ یہ نہیں۔ کہ یہ لوگ ایسا کیوں کہتے ہیں کہ میں ہندو نہیں ہوں۔ مسلمان نہیں ہوں۔ بلکہ حقیقی خطرہ جو ان کو یوں راتوں کو سونے نہیں دیتا یہ ہے کہ یہ لوگ مسلم جماعتوں کو تسلیم کیوں کرتے ہیں اور ان سے راہ و رسم کیوں رکھتے ہیں۔

سچ ہے۔ براہمن تہذیب کی رُو سے ملیکش ملیکش ہی رہتا ہے۔ خواہ لاکھ قوم پرست بنے۔
اور اس پر بھی وہ نہ سمجھے تو اس بُت سے خدا سمجھے

رفتار زمانہ

مصر میں انتخابات

آجکل مصر میں جدید انتخابات کی چہل پہل ہے اور یہ انتخابی دور مصر کی سیاست کا مرکزی نقطہ بنا ہوا ہے۔ گزشتہ انتخاب مئی ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا جسکے تحت مصری پارلیمنٹ نے زمام حکومت سنبھالی اور وفد پارٹی نے اپنی اکثریت کی بنا پر دستور کو ترتیب دیکر چلایا اور وادیٔ نیل میں ایک جمہوری حکومت قائم کر کے مصری سیاست کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کر دیا۔

چونکہ مصر میں وفد پارٹی کی بدولت جمہوری طرز کی حکومت قائم ہو چکی تھی اس لئے اسکو مزید تقویت پہونچانے کیلئے وفدیوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مصطفےٰ نحاس پاشا وزیر اعظم نے گذشتہ تجربوں کی بنا پر پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کیا جسکا مفاد یہ تھا کہ مصر کے دستور اساسی کا احترام حکومت کیلئے ضروری ہے اگر کوئی شخص دستور اساسی کے خلاف وزارت مرتب کر دے تو اس پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے وزیر اعظم کا یہ طرزِ عمل گذشتہ تجربات اور آئندہ کے خطرات پر مبنی تھا کیونکہ شاہ فواد مرحوم کے زمانہ میں جمہوری روح کو کئی بار کچلا جا چکا تھا اور شاہ مرحوم نے تین بار دستور اساسی کو بالائے طاق رکھ کر اور وزیر اعظم کو برطرف کر کے شخصی حکومت قائم کی تھی ۱۹۳۷ء کے اواخر میں مصطفےٰ نحاس کو پھر یہی خطرہ پیدا ہوا اور انہوں نے مندرجہ بالا مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش کرنے کیلئے پیشقدمی کی لیکن اقلیت والی جماعت نے شاہ فاروق سے تبادلہ خیال کر کے اس مسودہ قانون کو پارلیمنٹ میں پیش نہ ہونے دیا اور شاہ نے وزیر اعظم کو برطرف کر کے پارلیمنٹ کو توڑ دیا۔ مصر کا دستور اساسی بغیر پارلیمنٹ کے تین ماہ تک چلتا رہا اور آئندہ انتخابات کیلئے مصر کی سیاسی جماعتوں نے میدان تیار کرنا شروع کر دیا۔

مصر کی تاریخ میں ۶ اپریل ایک تاریخی دن ہوگا کیونکہ اس روز مصر میں عام انتخابات کے نتائج منظر عام پر آجائینگے۔ چنانچہ انتخابات کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئی ہیں۔

مصری پارلیمنٹ کی ۲۶۴ نشستوں کیلئے ۶۰۸ امیدواروں میں زبردست مقابلہ ہو رہا ہے سابق وزیر اعظم مصطفےٰ نحاس پاشا نے وفد پارٹی کی طرف سے ۱۴۵ امیدوار کھڑے کئے ہیں اور ۱۱۶ امیدوار موجودہ مشترک حکومت نے کھڑے کئے ہیں۔ تازہ ترین اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ انتخاب میں وفد پارٹی کو شکست ہو رہی ہے اور مخالف پارٹی کے امیدوار کامیاب ہو رہے ہیں مصر میں وفد پارٹی

تمام سیاسی پارٹیوں پر ہمیشہ غالب رہی ہے مگر اس انتخاب میں معاملہ بالعکس نظر آتا ہے۔ اسکی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مصر کا مشہور ترین روزنامہ "البلاغ" جو وفد پارٹی کا ترجمان خصوصی اور نحاس پاشا کا زبردست حامی تھا وفدی جماعت کا مخالف ہوگیا ہے۔ اس نے اس مخالفت کی ابتداء برطانی۔مصری معاہدہ سے کی تھی اور مصطفےٰ نحاس پاشا پر انگریزوں کے ہاتوں مصر کو فروخت کرنے کا الزام لگایا تھا۔ چونکہ یہ اخبار گھر کا بھیدی تھا اس لئے اس نے نہایت شدت کے ساتھ وفد پارٹی کی مخالفت کی اور اسکے خفیہ رازوں سے ملک کو آگاہ کیا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے وفدی جماعت کا اثر بہت کچھ زائل کردیا اور لوگوں کی ہمدردیاں جو اسکے ساتھ قائم تھیں وہ سب ختم ہوگئیں یہی وجہ ہے کہ موجودہ انتخاب میں مصطفےٰ نحاس پاشا کو سخت مشکلات پیش آرہی ہیں اور باوجود کوشش کے کامیابی کے آثار انکو بہت کم نظر آرہے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وفدی جماعت میں پھوٹ پڑگئی ہے۔ کچھ وفدی مصطفےٰ نحاس پاشا کے ساتھ ہیں اور کچھ احمد ماہر پاشا کے ساتھ اگر احمد ماہر پاشا کے حامیوں اور محمد محمود پاشا (موجودہ وزیر اعظم) کے ساتھیوں کی اتنی تعداد منتخب ہوگئی کہ دونوں ملکر نحاس پاشا کے حامیوں سے بڑھ گئے تو وہ دونوں مل جائینگے۔ اور نحاس پاشا کے ہاتھ سے انتخاب ثانی تک حکومت نکل جائے گی۔

فرض کرو کہ وفد پارٹی کامیاب ہوگئی تو شاہ مصر کو دستوری حکومت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑیگا اگر نہیں کرینگے تو تخت سے دستبردار ہونا پڑیگا اگر وہ ہارگئی تو شاہ مصر کے راستہ سے کانٹا ہٹ جائیگا۔ اور دستوری حکومت صحیح بنیادوں پر قائم نہ ہوسکے گی۔

انتخابات کے سلسلے میں اس وقت تک (یعنی ۵ر اپریل تک) جو اطلاعات موصول ہوچکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ انتخابی دور خونریزی کے بغیر ختم نہ ہوگا۔ چنانچہ نحاس پاشا کے وطن طنطا میں فساد ہوگیا اور بقول ریوٹر مصطفےٰ نحاس پاشا کے سات سو آدمیوں نے بہت سی دوکانوں کو لوٹ لیا اور برطانی قونصل خانہ پر حملہ کردیا پولیس نے بہت سی گرفتاریاں بھی کی ہیں اور منفلوط میں کسی شخص نے پولیس چیف پر فائر بھی کردیا اور چاقو سے بھی اسکو زخمی کرنے کی کوشش کی۔ زیریں مصر سے بالائی مصر کو فوج اور پولیس کے جتھے روانہ ہوگئے ہیں۔ ابھی تک پچاس اشخاص گرفتار کئے جاچکے ہیں۔ قاہرہ کا تازہ ترین تار مظہر ہے کہ شمالی مصر کے انتخاب میں حکومت کو کامیابی حاصل ہورہی ہے۔ اور فساد کے باعث ۴ اشخاص ہلاک ہوگئے ہیں۔ مانیہ میں ایک ٹیکسی ڈرائیور مارا گیا۔ اور طنطا میں بہت سے آدمی زخمی ہوئے ہیں جنمیں ۲۵ پولیس کے سپاہی بھی شامل ہیں

طلباء مصر میں وحدت اسلامی

قاہرہ کی ایک اطلاع ہے جمعیۃ شبان المسلمین کی عمارت میں مسلم طلبا کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں جامعہ ازہر۔ جامعہ مصریہ اور دیگر مدارس کے طلبا نے شرکت کی اور طلبا و علماء نے اپنی تقریروں میں یہ حقیقت واضح کی کہ اسلامی اصول جغرافیائی حدود سے منزہ ہیں کائنات کا ہر گوشہ مسلمان کا وطن ہے اور ہر وطن ہمدردی اور حمایت کا مستحق ہے جامعہ مصریہ کے نمائندے نے اتنا اور اضافہ کیا کہ اسلام نے ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ کے پیش نظر دین اور دنیا کی سرحدیں جدا قرار نہیں دیں بلکہ یہ فرمایا کہ مسلمان کا ہر قدم اسلام کی سربلندی اور رفعت کے لئے ہونا چاہیئے۔ آج دنیا نظام سیاست کی کمزوریوں سے نالاں ہے اور بیتابی کے ساتھ ایک فطری قانون کی تلاش میں ہے۔ اس لئے علماء کو ان کی دستگیری کے لئے کوئی اہم قدم اٹھانا چاہیئے۔ اس کانفرنس میں ذیل کی قراردادیں منظور ہوئیں۔

(۱) ملک کی جماعت بندیوں کو ختم کر کے الٰہی نظام حکومت کی بنیاد پر ایک جماعت کی تشکیل کیجائے۔

(۲) بلاد عربیہ میں ملکی مصنوعات کو فروغ دینے کیلئے کوشش کیجائے اور مغربی صنعتوں سے اجتناب کیا جائے

(۳) ممالک اسلامیہ سے روابط قائم کر کے وحدت اسلامی کی روح زندہ کیجائے۔

ترکی

ترکی حکومت اپنے اقتصادی نظام سے مطمئن ہو کر اپنا جنگی نظام مستحکم کر رہی ہے اور ایک نئے پروگرام کے تحت بری۔ بحری اور فضائی قوتوں میں بیش از بیش اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ایک امریکن کمپنی سے معاملہ طے کر کے حکومت ترکیہ نے اسلحہ کی خریداری کا انتظام کیا ہے۔ چند ہفتے پہلے امریکہ سے ہوائی جہاز بھی خریدے تھے۔ مگر جدید اسلحہ کی خریداری میں آبدوز کشتیوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ یہ بھی خبر ہے کہ ترکی حکومت کا ایک امریکن ایجنٹ ترکی کے لئے فولاد اور ضروری سامان جنگ خریدنے میں لگا ہوا ہے۔ ترکی حکومت نے اپنے ہوائی بیڑے کو زبردست تقویت پہونچائی ہے اور ہوائی جہازوں کی تعداد ایک ہزار تک پہونچا دی ہے۔ اس سال کے لئے حکومت نے صرف ہوائی جہازوں پر خرچ کرنے کے لئے ساڑھے تین کروڑ ڈالر منظور کئے ہیں اسکے علاوہ جرمنی کا کارخانہ کروپ رورز کوسلوا کیہ کا کارخانہ سکوڈا اس وقت دردانیال کے فوجی قلعوں کے لئے سامان جنگ بنانے میں مشغول ہیں اور خود ترکی بھی اپنے یہاں فولاد کے کارخانہ قائم کر رہا ہے۔ استنبول میں آبدوز کشتیوں کے کارخانہ رات دن چل رہے ہیں۔ اور اس نے حال ہی میں حکومت کو دو آبدوز بنا کر دیئے ہیں

چند روز ہوئے انگورہ میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت میں ریاستہائے بلقان کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حبش پر اٹلی کا اقتدار تسلیم کرلیا گیا۔ اور اس کے جواب میں اٹلی نے دردانیال پر ترکی کا حق تسلیم کرلیا۔ کانفرنس مذکور میں غازی کمال پاشا نے ایک تقریر بھی کی جس میں بلقانی اتحاد کو امن و سلامتی کیلئے ضروری قرار دیتے ہوئے اپنے فوجی نظام کی اہمیت بتائی اور فرمایا کہ ہم موجودہ سیاسیات سے علیحدہ رہ کر ہر حکومت سے تعاون کرنا چاہتے ہیں اور اپنی داخلی آزادی کو برقرار رکھنے کی ضرورت سے غافل نہیں ہیں اگر دنیا کی کوئی حکومت ہم سے چھیڑ چھاڑ کریگی تو ترکی کا بچہ بچہ اسکا مقابلہ کرنے کیلئے میدان میں نکل آئیگا۔ اگر ہم اقدام کو پسند نہیں کرتے تو مدافعت سے بھی گریز نہیں کرینگے۔

ترکی کے مندرجہ بالا حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ترکی حکومت یورپ کی سیاسیات سے بے خبر نہیں ہے اور نہ اسکو معاہدوں پر کسی قسم کا اطمینان ہے وہ خود اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر دوسروں کا احترام کرنا چاہتی ہے اور جنگ عظیم کے بعد اسکو سب سے بڑا سبق یہی ملا ہے کہ اپنی قوت کے بعد دوسروں سے تعاون کرنا چاہئے۔

فلسطین

ارض مقدس فلسطین میں ابھی تک شورش برپا ہے اور روزانہ مسلح عربوں اور برطانی فوج میں مڈھ بھیڑ ہو رہی ہے۔ یہودی عربوں کی جان لے رہے ہیں اور عرب ظالموں کو باہر نکالنے کیلئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں، فوجی عدالتوں سے عربوں کو پھانسی کی سزا مل رہی ہے، حملہ آوروں پر طیاروں سے بم برسائے جا رہے ہیں۔ قصبات و دیہات پر تعزیری ٹیکس لگا دیئے گئے ہیں اور عرب ججوں اور قاضیوں کو برطرف کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف عرب بھی برطانی فوج اور یہودی آبادیوں پر حملے اور برقی تار اور ٹیلیفون کے سلسلے منقطع کر رہے ہیں غرض ایک سال پہلے جو حالت تھی وہ اب بھی باقی ہے اور ارض انبیاء سے امن و امان مفقود ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں عرب جو کچھ کر رہے ہیں وہ بدرجہ مجبوری ہے کیونکہ وہ اپنے وطن پر یہودیوں کے تسلط کو برداشت نہیں کر سکتے اور جب سے فلسطین کو تقسیم کرنے کی اسکیم تیار ہوئی ہے وہ مایوس ہو کر کھلم کھلا مقابلہ پر آگئے ہیں۔

خیر یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا مگر حکومت برطانیہ نے حال ہی میں عربوں کے خلاف جو قدم اٹھایا ہے وہ فلسطین کی مجلس الاسلامی الاعلیٰ کا تعطل ہے۔ حکومت کو معلوم تھا کہ یہ مجلس عرب اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد اسلامی کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور اس نے گذشتہ سات سال میں عالم اسلامی کو فلسطین کی طرف متوجہ کرنے کا زبردست فرض انجام دیا ہے۔ اور جب تک اسکا وجود باقی ہے اور آزاد مسلمان اسکے نگراں ہیں اسوقت تک فلسطین سے مسلمانان عالم کا رشتہ منقطع نہیں ہو سکتا چنانچہ

اس نے بطور آخری تدبیر کے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا اسکا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

گذشتہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں سید امین حسینی مفتی اعظم فلسطین کو دینی قیادت سے محروم کرنے کی غرض سے صدارت سے معزول کر دیا گیا اور مجلس اسلامی کو جسکے تحت لاکھوں روپیہ سالانہ کے اوقاف ہیں اور جنکی آمدنی سے واعظین و مصلحین اور محاکم شرعیہ کے قضاۃ کا تقرر عمل میں آتا تھا، ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جسکے ارکان میں سے دو رکن انگریز ہیں۔ اس کمیٹی نے سب سے پہلے جو کام انجام دیا وہ اسلامی اوقاف پر تسلط تھا چنانچہ اوقاف پر قبضہ کیا گیا۔ اس کے مخصوص معاملات پر سرکاری نگرانی قائم کردی گئی اور اس کے عہدہ داروں کو برطرف کر کے اس میں سرکاری افسر متعین کر دیے گئے۔

اس کے بعد صرف یہی نہیں کہ محاکم شرعیہ اور محکمہ اوقاف سے دس عہدیداروں کو برطرف کر دیا گیا ہو۔ بلکہ ان کی جگہ اپنی گوں کے عہدیدار رکھے گئے۔ اور اوقاف کے میزانیہ میں جابرانہ دراندازی کی گئی اور ان سب سے زیادہ خطرناک اقدام یہ ہے کہ محاکم شرعیہ کو مجلس الاسلامی الاعلیٰ سے ہمیشہ کے لئے جدا کر کے برطانی عدالتوں سے ملحق کر دیا گیا۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اسلام کی قوت تشریع مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر مستعمرین کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اور مسلمان قاضی حکومت انتداب کے رحم وکرم پر چھوڑ دیے گئے۔ کہ ان کو حکومت جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محاکم شرعیہ کے جو قاضی برطرف کئے گئے تھے انکو حکومت نے الزام لگاکر عکا کی جیل میں بند کر دیا ہے اب اسکے بعد فلسطین کا اسلامی اور مذہبی شعبہ حکومت کے قبضہ آگیا ہے اور یہ ثبوت ہے حکومت کے اس دعوی کا کہ وہ مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی!۔

اس کے بعد حکومت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ کہ اس نے مجلس الاسلامی الاعلیٰ کا دفتر مسجد اقصی کے پہلو سے اٹھا کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا ہے۔ تاکہ جو مسلمان اس میں آنا چاہے۔ وہ سرکار سے اجازت لیکر آئے اور مسجد اقصی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہے

یمن اور اٹلی حکومت یمن کو اٹلی کی طرف سے زبردست خطرہ ہے اور نہر سویز پر اٹلی کے نئے مطالبہ نے یہ اندیشہ اور قوی کر دیا ہے چنانچہ یمن کے ساحل پر جنگی تیاریاں شروع کر دی گئی ہیں۔ اور ایسی خندقیں کھودی جارہی ہیں۔ جن میں بیک وقت بیس ہزار سپاہی قیام کر سکیں۔ ان خندقوں کو ضروری سامان سے لبریز کر دیا گیا ہے۔ بالائے عرب سے پندرہ ہزار بے قاعدہ بدو یہاں پہونچ گئے ہیں۔ اور ان سے دو فوجی دستے تیار کر لئے گئے ہیں۔

باب المندب کے اطراف کی پہاڑیوں کو مستحکم کرلیا گیا ہے اور اس وقت ہزاروں مزدور شبانہ روز باولیاں کھودنے اور سڑکیں بنانے میں مصروف ہیں یہ سڑکیں دارالحکومت صنعاء کو یمن کی عظیم الشان بندرگاہ حدیدہ سے ملا دیں گی۔ مساجد میں واعظین کرام لوگوں کو ہدایت کر رہے ہیں کہ اگر اٹلی ساحل اریٹیریا سے یمن پر حملہ کردے تو وہ زہریلی گیس سے محفوظ رہیں

اس کے ساتھ ولی عہد یمن نے ایک برطانی کارخانہ کو بارود اور گولیوں کے لئے آرڈر دیا ہے۔ اس میں دس گولہ باری کرنے والی بڑی توپیں بھی شامل ہیں۔

امام یمن نے حکومت عراق سے فوج طلب کی ہے۔ تاکہ وہ وقت ضرورت ساحل یمن کی حفاظت کر سکے۔ یمن کے معاملہ میں اٹلی کی بدنیتی کا حال اس سے معلوم بھی ہوسکتا ہے۔ کہ عدیس ابابا (حبش) سے اطالوی حکام نے یمن کے چند عربوں کو نکل جانے کا حکم دیدیا ہے اور باقی یمنیوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے پیشہ اور نام درج رجسٹر کرائیں! اس کے جواب میں یمن میں بھی اطالوی باشندوں کو اپنے پاسپورٹ دکھانے کا حکم دیدیا گیا ہے۔ اور پولیس کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جس اطالوی باشندہ کو چاہیں یمن سے نکال دیں۔

مہاپاپ

کانگرسی صوبوں میں ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہو کر مہاتما گاندھی نے لکھا ہے، کانگرسی حکومت برطانوی حکومت کا کچھ اچھا بدل ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ فسادات کو روکنے کے لئے انھیں تشدد کا استعمال کرنا پڑا ہے۔ جو مہاپاپ ہے۔ غالباً گاندھی جی کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح فوج کا شعبہ حکومت برطانیہ نے اپنے پاس ہی رکھا ہے۔ پولیس کا شعبہ بھی اسی طرح اپنے ہی پاس رکھتی تو اچھا تھا۔ تاکہ ایسے فسادات کو روکنے کے لئے جب قوت کا استعمال کرنا پڑتا تو اس کا پاپ انگریزوں کے سر ہوتا۔ کانگرسی وزراء کے سر نہ ہوتا۔ ہندی سیاست کی لغت میں اہنسا (عدم تشدد) کی تعریف یہ لکھی ہے کہ گائے کے سینگ تو انگریز پکڑے رہیں اور اس کا دودھ ہندو دوہتے رہیں۔ تاکہ پاپ کے ذمہ دار دوسرے لوگ ٹھہریں اور اس کا منافع یہ حضرات اٹھاتے رہیں۔ جس طرح گئو ہتیا کے مجرم تو بچارے چمار ہوتے ہیں اور چمڑے کی تجارت کے مالک تمام بھلے اور مہاتما جی کہ جن کے آسرے گئو رکھشا سبھائیں چلتی ہیں۔